شکیب جلالی

(۱۹۲۵ء - ۱۹۷۳ء)

تعارف:

زندگی کے حالات: سید حسن رضوی شکیبؔ جلالی قصبہ جلالی، ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم بدایوں میں حاصل کی۔ شکیبؔ جلالی کی معاشی حالت شروع سے ہی خراب تھی۔ والد کی بیماری کے باعث سارے گھر کی ذمہ داری اُن پر آن پڑی۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ پاکستان چلے آئے اور لاہور سے بی۔ اے کیا۔ ابتدائی میں رسائل کے دفاتر میں ملازمت کی پھر محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ ان کی تمام زندگی کرب و ملال اور تلخیوں میں گزری۔ وہ اکثر بیمار رہا کرتے تھے اور آخر میں کئی ذہنی و نفسیاتی امراض کا شکار ہو گئے تھے۔ وہ صرف ۳۲ برس کی عمر میں اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

ادبی خدمات: شکیبؔ جلالی کا مجموعہ کلام ''روشنی'' بہت جلد مقبول ہوا اور اس کے اکثر اشعار زبان زد خاص و عام ہو گئے۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز اس وقت کیا جب اردو غزل نئے امکانات اور تجربات سے گزر رہی تھی۔ ذہنی اور فکری رویّوں میں تبدیلی آ رہی تھی۔ اُس دور میں ایسے شعرا قابلِ قدر جانے جاتے تھے جن کے ہاں عصری شعور کے ساتھ ساتھ تجربات اور مشاہدات میں بھی جدّت نظر آئے۔ جدید رجحانات کے باعث شکیبؔ جلالی بہت جلد ممتاز ہو گئے۔ وہ آسان زبان کے شاعر سمجھے جاتے ہیں لیکن ان آسان الفاظ میں بھی معنوی تہہ داری موجود ہے۔ شکیبؔ جلالی نے چند ایک نظمیں بھی کہی ہیں۔ لیکن ان کی اصل مہارت غزل کے میدان میں ہے۔

مجموعۂ کلام: روشنی اے روشنی۔

لغت و توضیحات

تعارف (صفحہ نمبر 232)

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
کرب و ملال	تکلیف اور دکھ	جدّت	نئی چیز لانا
امکانات	جو ممکن ہو سکے	معنوی تہہ داری	معنی کے لحاظ سے گہرائی

اشعار کی تشریح

(۱)

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے ۔ جتنے اُس پیڑ کے پھل تھے، پسِ دیوار گرے

لغت: پیڑ: درخت۔

مفہوم: پتھر میرے گھر کے صحن میں گرتے ہیں لیکن درخت کا پھل میری دیوار سے باہر گرتا ہے۔

Geniusnesthub.com

CamScanner

تشریح

شکیبؔ جلالی کا مجموعہ کلام ''روشنی'' بہت جلد مقبول ہوا اور اس کے اکثر اشعار زبان زدِ خاص و عام ہو گئے۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز اس وقت کیا جب اردو غزل نئے امکانات اور تجربات سے گزر رہی تھی۔ جدید رجحانات کے باعث شکیبؔ جلالی بہت جلد ممتاز ہو گئے۔ وہ آسان زبان کے شاعر سمجھے جاتے ہیں لیکن ان آسان الفاظ میں بھی معنوی تہہ داری موجود ہے۔

(تعارفی عبارت ہر شعر کی تشریح میں لکھی جا سکتی ہے)

اس شعر میں شاعر اپنی بدقسمتی کا نوحہ بیان کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی زندگی ایک غم انگیز کرب کا نام ہے۔ وہ زندگی بھر دکھوں اور غموں کو جھیلتا رہا ہے اور اسے زندگی میں خوشی دیکھنے کے مواقع کم ہی میسر آئے ہیں۔ وہ اپنے حالات کی زنجیروں میں بندھا ہوا ایک بے بس مخلوق ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ خوشی دیکھنے کا موقع میسر بھی آیا تو اس کے حصے میں صرف غم ہی آئے۔ خوشی اس کے گھر کی دیواروں سے پار ہی رہی۔ اپنی بدقسمتی کا نوحہ لکھنے کے لیے وہ درخت کی مثال دیتا ہے۔ وہ پھل دار درخت جو اس کے صحن میں لگا ہے۔ جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے لگایا ہے۔ اس درخت کی نشوونما میں اس کا خونِ جگر بھی شامل ہے۔ گویا یہ اس کی محنت کا ثمر ہے۔ لیکن شاعر بدقسمتی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب اس درخت سے پھل اتارنے کا وقت آیا تو اس کے حصے میں صرف پتھر ہی آئے جو اس کے صحن میں آ کے گرے۔ جب کہ درخت کا پھل ہمیشہ دیوار کے پار ہی گرا۔ دراصل شاعر کہنا چاہتا ہے کہ وہ جب اچھے دنوں کی امید سے لبریز ہوتا ہے، تب بھی برے دن کہیں سے آ جاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہوئے بھی زندگی سے خوشیاں کشید نہیں کر پاتا۔ خوشی اس کے گھر کی طرف آتے آتے کہیں اور نکل جاتی ہے۔ اس کے حصے میں ہمیشہ دکھ ہی آتے ہیں جنھیں وہ چنتا رہتا ہے۔ میر تقی میر نے اپنی ایسی ہی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا تھا:

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

(۲)

مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

لغت: سایۂ دیوار: دیوار کا سایہ۔

مفہوم: اگر مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں گا جیسے دیوار اپنے سائے گرتی ہے۔

تشریح

اس شعر میں شاعر اپنی خودداری کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگرچہ حالات بہت مشکل ہیں اور جینا موت سے بھی بدتر ہے۔ اس کی زندگی پر غموں کے گہرے سائے ہیں۔ ہر طرف ناامیدی کے گہرے اندھیرے ہیں۔ اس کی زندگی مفلس کے چراغ کی مانند ہے جو شام ہوتے ہی بجھ جاتا ہے۔ اس کے حصے میں ہمیشہ صرف پتھر ہی آتے ہیں، پھل ہمیشہ دیوار کی دوسری طرف گرتا ہے۔ وہ بہت سے تکلیفوں اور مصیبتوں سے گزر رہا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی خودداری کو ترک نہیں کرے گا۔ وہ اپنی انا اور غیرت پر کبھی آنچ نہیں آنے دے گا۔ اگر ان تمام مشکل ترین حالات میں اسے گرنا بھی پڑا تو وہ کسی کے قدموں میں نہیں گرے گا یعنی وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے گا۔ وہ کسی سے زندگی کی بھیک نہیں مانگے گا۔ وہ اپنی غیرت اور خودداری کا سر بلند رکھے گا۔ وہ کسی کے آگے اپنا ہاتھ نہیں پھیلائے گا۔ اگر اسے گرنا ہوا تو وہ اپنے ہی قدموں میں گرے گا

Geniusnesthub.com
CamScanner

بالکل ویسے جس طرح ایک دیوار جب گرتی ہے تو وہ اپنے ہی سائے پر گرتی ہے۔ یہاں شاعر نے اپنے گرنے کو دیوار کے گرنے اور اپنی زندگی کی تاریکیوں کو دیوار کے سائے سے تشبیہ دی ہے۔ کیف بھوپالی نے کہا تھا:

جس دن مری جبیں کسی دہلیز پر جھکے — اس دن خدا شگاف مرے سر میں ڈال دے

(۳)

تیرگی چھوڑ گئے دل میں، اُجالے کے خطوط — یہ ستارے مرے گھر ٹوٹ کے، بے کار گرے

لغت: تیرگی: اندھیرا۔ خطوط: خط کی جمع، لکیر یہاں مراد ستاروں کی روشنی۔

مفہوم: ستاروں کی روشنی بھی میرے دل میں اندھیرا چھوڑ گئی ہے، یہ ستارے میرے گھر میں بے کار ہی گرے ہیں۔

تشریح

اس شعر میں شاعر اپنی دل کی تاریکی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے دل کی دنیا میں اتنے گہرے اندھیرے ہیں کہ روشنی انھیں بدل نہیں سکتی۔ اس لیے اگر ستارے بھی میرے گھر میں اتر آئیں تو ان کا اترنا بے کار ہی جائے گا۔ دراصل جہاں اندھیرا بہت گہرا ہوتا ہے، وہاں روشنی بھی دم توڑ دیتی ہے۔ یہی اس شعر کا مدعا ہے کہ شاعر کی زندگی میں غم اور دکھ اس قدر زیادہ ہیں کہ اس کی زندگی پر ہر وقت غم کے گہرے اندھیرے مسلط رہتے ہیں۔ اس کی زندگی میں روشنی کا گزر ممکن ہی نہیں ہے۔ اپنی زندگی کے ان گہرے اندھیروں سے کے ساتھ جینا ہی اس کا مقدر ہے۔ وہ اس تاریکی میں روز جیتا ہے اور روز مرتا ہے۔ وہ روشنی کی تمنا تو رکھتا ہے لیکن اس کے گھر کی تاریکیوں میں روشنی کا گزر ممکن ہی نہیں ہے۔ یہاں شاعر صنعت تضاد کا استعمال کرتے ہوئے اپنی دل کے اندھیروں کو بیان کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اندھیرے اس قدر گہرے ہیں کہ روشنی کی شعاعیں اس میں داخل ہو جائیں تو وہ بھی اندھیروں میں بدل جاتی ہیں۔ اس لیے جو ستارے آسمان سے ٹوٹ کر اس کے صحن میں آن گرے ہیں، ان کا گرنا میرے لیے بے کار ہے۔ ان کے اس طرح میرے گھر میں گرنے سے روشنی ہو جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ گویا شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ جو کچھ بھی ہو جائے، کیسی ہی خوشی کے لمحات ہوں، اس کی زندگی میں غم کے گہرے سائے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

آج کی رات بھی تنہا ہی کٹی — آج کے دن بھی اندھیرا ہوگا

(۴)

دیکھ کر اپنے در و بام، لرز جاتا ہوں — مرے ہمسائے میں جب بھی کوئی دیوار گرے

لغت: در و بام: دیوار اور چھت۔

مفہوم: میرے ہمسائے میں جب بھی کوئی دیوار گرتی ہے تو میں اپنی دیواروں اور چھت کو دیکھ کر لرز جاتا ہوں۔

تشریح

اس شعر میں شاعر نے اپنی نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا ہے کہ اس کے ہمسائے میں جب بھی کوئی مصیبت آتی ہے تو اسے یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ اب یہ مصیبت اس کے گھر کا راستہ بھی دیکھ لے گی۔ یہ دراصل ڈر اور اندیشے کی کیفیت ہے۔ جب غم اور دکھ انسان کی زندگی کو ویران کر دیں اور مصیبتوں کے گہرے سائے، ہر روشنی کو ضبط کر لیں تو یہ ممکن ہے کہ انسان اس نفسیاتی کیفیت کا شکار ہو کر ڈر اور اندیشوں کا

Geniusesthub.com
CamScanner

شکار ہو جائے۔ ایسا انسان پھر ہر آہٹ سے بھی خوف زدہ رہتا ہے۔ ہر کھٹکے پر اسے یہی احساس ہوتا ہے کہ اب کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ ظاہری بات ہے کہ ایسا انسان جو بہت زیادہ مصیبت زدہ ہو، اس کے لیے اس کیفیت کا شکار ہو جانا اچنبھے کی بات نہیں۔ بقول سراج فیصل خان:

خوف آتا ہے اپنے سائے سے ہجر کے کس مقام پر ہوں میں

اگرچہ اللہ پر بھروسا ہر ڈر اور اندیشے کو مٹا دیتا ہے لیکن انسان تو انسان ہی ہے۔ وہ کمزور بھی ہے اور کم ہمت بھی ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ شاعر زندگی کے دکھ اور پریشانیوں سے اس قدر پریشان حال ہو کہ اس کی ذہنی کیفیت ڈر اور اندیشوں سے لبریز ہو۔ اس لیے شاعر کہتا ہے کہ جب کسی ہمسائے میں یا کسی دوست کو کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کا اپنا دل انجانے اندیشوں سے لرزنے لگتا ہے کہ اب یہ مصیبت اس کی زندگی کو بھی نہ وبالا کرنے والی ہے۔ یعنی وہ کسی کی مصیبت دیکھ کر بھی سخت خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ کیفیت ایک مایوسی کی کیفیت بھی ہے۔ یعنی شاعر کو یقین ہے کہ اس کی زندگی میں خوشی کا گزر ممکن ہی نہیں ہے۔ خوشی اس کی زندگی میں آ کر غم کے گہرے سایوں میں بدل جاتی ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کا مقدر صرف غم اور دکھ سہنا ہی ہے۔ شکیل بدایونی نے کہا تھا:

نئی صبح پر نظر ہے مگر آہ یہ بھی ڈر ہے یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے

(۵)

وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے کس گھڑی سر پہ یہ لٹکی ہوئی تلوار گرے

مفہوم: خدا جانے کب زندگی کی ڈور ٹوٹ جائے اور یہ لٹکی ہوئی تلوار سر پر آن گرے۔

تشریح

اس شعر میں شاعر زندگی کی بے ثباتی اور غیر یقینی ہونے کو موضوع بناتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ زندگی کی ڈور کب ٹوٹ جائے اور ہمارے سروں پر جو موت کی تلوار لٹک رہی ہے، وہ ہم پر آن گرے۔ اس شعر کے بہت سے پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی اللہ کی دین ہے اور موت برحق ہے۔ جیسا کہ اللہ سورہ اعراف آیت نمبر ۱۵۸ میں میں فرماتا ہے کہ:

"وہی زندگی دیتا ہے، وہی موت دیتا ہے"

پھر وہی اللہ ہی ہے جس نے ہر انسان کی زندگی کا وقت مقرر کر کے اسے اس دنیا میں بھیجا ہے اور ہر کسی کو اپنے مقررہ وقت تک اس دنیا میں رہنا ہے، نہ ایک گھڑی اس سے پہلے نہ ایک گھڑی اس کے بعد۔ لیکن کوئی یہ نہیں جانتا کہ اس کا مقررہ وقت کیا ہے۔ وہ کب اور کیسے اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ یوں زندگی اور موت کے دو رخ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی فانی اور بے ثبات ہے، دوسرا یہ کہ یہ غیر یقینی ہے۔ یہی شاعر کا اس شعر میں مدعا ہے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ زندگی کی ڈور کب ٹوٹ جائے۔ اور ہمارے سروں پر جو موت کی تلوار لٹک رہی ہے، وہ ہمارے سروں پر آن گرے۔ بقول شاعر:

موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے

Geniusnesthub.com

(۶)

دیکھتے کیوں ہو شکیبؔ اتنی بلندی کی طرف　　نہ اُٹھایا کرو سر کو کہ یہ دستار گرے

مفہوم: اے شکیب تم اتنی بلندی کی طرف کیوں دیکھتے ہو کہ تمھارے سر کی پگڑی زمین پر گر جائے۔

تشریح

غزل کے مقطع میں شاعر نصیحت کے انداز میں تاکید کرتا ہے کہ انسان کو اپنی حد سے بڑھ کر کوئی خواہش نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ ایسا کرنے سے ہمیشہ اس کا اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ سر اٹھانے اور پگڑی گرنے کی مثال دیتا ہے کہ اگر انسان سر اٹھا کر بہت زیادہ بلندی کی طرف دیکھنے کی کوشش کرے گا تو اس کے سر سے پگڑی بھی گر جائے گی۔

دراصل ہر انسان اپنا نصیب لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ چوں کہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے نصیب میں کیا لکھا ہے، اس لیے وہ اپنی ہمت کے مطابق کوشش کرتا ہے اور اپنا نصیب پا لیتا ہے۔ لیکن اصول یہ ہے کہ دنیا کے ہر انسان کا مقدر الگ الگ ہے۔ جیسا کہ اللہ قرآن میں فرماتے ہیں کہ وہ کسی کو زیادہ رزق دیتے ہیں اور کسی کو کم۔ اسی طرح کسی کو دنیا میں عزت اور مقام زیادہ ملتا ہے اور کسی کو کم۔ تو یہ ہر انسان کی ہمت، کوشش کے ساتھ ساتھ اس کے نصیب پر بھی منحصر ہے۔ لیکن اگر انسان اپنے نصیب پر شکر کرنے اور اسی میں راضی نہ رہے تو وہ ضرور دوسروں کو دیکھنے اور پھر اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلانے کی کوشش کرے گا۔ یہی سے اس خرابی کا آغاز ہوتا ہے جسے حسد اور ناشکری کہا جاتا ہے۔ پھر وہ دوسروں کے مال پر نظر رکھتا ہے، ان کے مقام مرتبے کو حسد کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اپنی چادر سے باہر نکل کر وہ سب کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ یہ سب کچھ کرنے سے انسان اپنا ہی نقصان اٹھاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایسی تکلیف میں مبتلا کر لیتا ہے جو اسے کسی پل بھی چین نہیں لینے دیتی۔ وہ اپنی حد سے باہر نکل کر ان چیزوں یا مقام کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ غلط راستے اختیار کرتا ہے اور جس کی وجہ سے اس کی عزت پر حرف آتا ہے۔ وہ دوسروں کی نظر میں حقیر اور ذلیل ہو جاتا ہے۔ بقول اقبال عظیم:

اپنی مٹی ہی پہ چلنے کا سلیقہ سیکھو　　سنگ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے

مشق

ا۔ کلام میں اعداد کا ذکر کرنا، خواہ ترتیب سے ہوں یا بے ترتیب ہوں، صفت الاعداد کہلاتا ہے۔ جیسے:

آ کے پتھر تو مرے صحن، میں دو چار گرے　　جتنے اُس پی کے پھل تھے، پسِ دیوار گرے

سیاقۃ الاعداد کی مزید تین مثالیں لکھیں۔

جواب:

ہے ایک اور بھی صورت کہیں مری ہی طرح　　اک اور شہر بھی ہے قریۂ صدا کے سوا

اس شعر میں ''ایک'' اور ''اک'' صنعت سیاقۃ الاعداد کی صورت ہے۔

روشنی دکھا دوں گا ان اندھیر نگروں میں　　اک ہوا ضیاؤں کی چار سُو چلا دوں گا

Geniusnesthub.com
CamScanner

اس شعر میں ''اک'' اور ''ہزار'' صنعت سیاقۃ الاعداد کی صورت ہے۔

یہ فخر تو حاصل ہے برنے ہیں کہ بھلے ہیں
دو چار قدم ہم بھی تیرے ساتھ چلے ہیں

اس شعر میں ''دو چار'' صنعت سیاقۃ الاعداد کی صورت ہے۔

۱۔ درج ذیل الفاظ کے مترادف لکھیں۔

پیڑ، تیرگی، ہمسایہ، بلندی، اُجالا۔

الفاظ	مترادف
پیڑ	درخت
تیرگی	اندھیرا
ہمسایہ	پڑوسی
بلندی	اُونچائی
اُجالا	روشنی

۲۔ اس غزل کے اُس شعر کی نشان دہی کریں، جس میں صنعتِ تضاد کا استعمال ہے۔

تیرگی چھوڑ گئے دل میں، اجالے کے خطوط
یہ ستارے مرے گھر کے ٹوٹ کے بے کار گرے

اس شعر میں ''تیرگی'' اور ''اجالے'' سے صنعتِ تضاد کی صورت پیدا ہوئی ہے۔

۴۔ دی گئی غزل کے مطابق درج ذیل سوالوں کے جواب لکھیں:

1۔ ''صحن میں پتھر گرنے'' سے کیا مراد ہے؟

جواب: شاعر کے مطابق صحن میں پتھر گرنے سے مراد مصیبتوں اور غموں کا آنا ہے۔

2۔ شاعر کے دل میں کون تیرگی چھوڑ گئے؟

جواب: شاعر کے دل میں تیرگی چھوڑ کے جانے والے دراصل ستارے ہیں جو اس کے گھر میں گرتے تو ہیں لیکن ان کی روشنی بھی اندھیروں میں بدل جاتی ہے۔ اسی لیے شاعر کہتا ہے کہ ان کا گرنا بھی بے کار ہی ہے۔

3۔ شاعر کیوں لرز جاتا ہے؟

جواب: شاعر جب بھی ہمسائے میں کوئی مصیبت یا غم دیکھتا ہے تو وہ اپنے گھر کو دیکھ کر لرز جاتا ہے کہ جانے کب یہ مصیبت اور غم اس کے گھر کی طرف رخ کر لے گی۔

4۔ وقت کی ڈور ٹوٹنے سے کیا مراد ہے؟

جواب: وقت کی ڈور ٹوٹنے سے مراد زندگی کی مہلت ختم ہو جانا ہے۔ چوں کہ ہر شخص ایک مقررہ وقت تک کے لیے اس دنیا میں آیا ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ یہ مہلت کب تک کے لیے ہے، اس لیے جیسے ہی وقت کی مہلت ختم ہو گی اور سروں پر لٹکتی ہوئی موت کی تلوار سر پر آن گرے گی۔

5۔ شاعر نے بلندی کی طرف دیکھنے سے کیوں منع ہے؟

جواب: شاعر بلندی کی طرف دیکھنے سے اس لیے منع کرتا ہے تاکہ سر پر رکھی ہوئی دستار نہ گر پڑے۔

Geniusnesthub.com

اضافی مختصر سوال جواب

سوال ۱: شاعر کہاں اور کس کی طرح گرنا چاہتا ہے؟

جواب: شاعر کہتا ہے کہ اگر وہ گرے گا تو اپنے ہی قدموں میں گرے گا اس کے لیے وہ مثال ایک دیوار کی دیتا ہے کہ جس طرح ایک دیوار اپنے ہی سائے پر گر جاتی ہے۔

سوال ۲: شاعر کے نزدیک ستارے ٹوٹ کر اُس کے گھر میں بے کار کیوں گرے ہیں؟

جواب: شاعر کے نزدیک ستاروں کا اس کے گھر میں گرنا اس لیے بے کار ہے کیوں کہ وہ ستارے گرنے کے بعد بھی تاریکی ہی چھوڑ گئے ہیں۔

سوال ۳: شاعر نے وقت کی ڈور کے بارے میں یہ کیوں کہا ہے کہ خدا جانے وہ کہاں سے ٹوٹے؟

جواب: شاعر نے وقت کی ڈور کے بارے میں یہ اس لیے کہا ہے کیوں کہ اگرچہ ہر انسان کا وقت معین ہے لیکن کوئی یہ نہیں جانتا کہ وقت کی ڈور کب اور کہا ٹوٹ جائے گی۔

اضافی کثیر الانتخابی سوالات

☆ ہر سوال کے چار ممکنہ جوابات (ا، ب، ج، د) دیئے گئے ہیں، درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

-1 شکیب جلالی کا سنِ پیدائش ہے:

ا۔ ۱۹۳۲ء ب۔ ۱۹۳۳ء ج۔ ۱۹۳۴ء د۔ ۱۹۳۵ء

-2 شکیب جلالی کا سنِ وفات ہے:

ا۔ ۱۹۶۶ء ب۔ ۱۹۶۷ء ج۔ ۱۹۶۸ء د۔ ۱۹۶۹ء

-3 شکیب جلالی کہاں پیدا ہوئے؟

ا۔ دہلی ب۔ لکھنؤ ج۔ فیض آباد د۔ علی گڑھ

-4 شکیب جلالی کا مجموعہ کلام بہت مقبول ہوا:

ا۔ روشنی ب۔ روشنی اے روشنی ج۔ اے روشنی د۔ روشن

-5 شاعر کے صحن میں کیا چیز آ کر گری؟

ا۔ پتھر ب۔ پھل ج۔ دیوار د۔ پرندہ

-6 شاعر کہاں گرنا چاہتا ہے؟

ا۔ زمین پر ب۔ اپنے ہی قدموں میں ج۔ دوسروں کے قدموں میں د۔ پانی میں

-7 جب کبھی ہمسائے میں دیوار گرے تو شاعر کیا دیکھ کر لرز جاتا ہے؟

ا۔ نقصان ب۔ دوسروں کے گھر ج۔ اپنے در و بام د۔ لوگوں کو

-8 سر پر کیا چیز لٹک رہی ہے؟

ا۔ وقت ب۔ تلوار ج۔ قسمت د۔ دعا

جوابات

-1	ج	-2	ا	-3	د	-4	ب	-5	ا
-6	ب	-7	ج	-8	ب				

Geniusnesthub.com
CamScanner

احمد فراز

(1933ء - 2008ء)

تعارف:

زندگی کے حالات: سید احمد شاہ احمد فراز کوہاٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید محمد شاہ برقؔ تھا جو خود بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ اس لحاظ سے فراز نے ایک ادبی ماحول میں آنکھ کھولی۔ احمد فرازؔ نے ایڈورڈز کالج پشاور سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور پھر پشاور یونیورسٹی سے اردو فارسی میں ایم۔اے کیا اور کچھ عرصے اسی یونیورسٹی میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ اس کے علاوہ اکادمی ادبیات کے ڈایریکٹر اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے سربراہ بھی رہے۔ احمد فرازؔ آزادی اظہار کے قائل تھے، اس وجہ سے انھیں فوجی حکومتوں میں شدید تکالیف کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن اُنھوں نے کبھی اپنے اصولوں پر سمجھوتہ نہ کیا۔ یہاں تک کہ ۲۰۰۴ء میں ملنے والا اعزاز ''ہلالِ امتیاز'' انھوں نے اس بنا پر واپس کر دیا کہ حکومت انسانی حقوق کی کھُلم کھُلا خلاف ورزی کر رہی تھی۔ اسی طرح کوہاٹ میں موجود پبلک لائبریری کو پلازے میں تبدیل کرنے پر وہ اس قدر دِل برداشتہ تھے کہ اُنھوں نے وصیت کہ کہ مجھے مرنے کے بعد کوہاٹ میں دفن نہ کیا جائے۔

ادبی خدمات: احمد فرازؔ کی شاعری کو جتنا قبولِ عام حاصل ہُوا، شاید ہی کسی اور کو حاصل ہوا ہوگا۔ سہلِ ممتنع میں شعر کہنا اور پھر اُسے عوام و خواص کے ذہن میں مرتسم کرنا، احمد فراز کے لیے بے حد آسان کام تھا۔ ان کے کلام میں شگفتگی کے ساتھ ساتھ قدرے تفکر بھی پایا جاتا ہے۔ سماجی ناانصافیوں پر احتجاج تقریباً ہر شاعر کا موضوع رہا ہے لیکن احمد فراز کے ہاں یہ رنگ سب سے جدا ہے۔ ان کی شاعری کے تیرہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

مجموعہ ہائے کلام: تنہا تنہا، دردآشوب، نایافت، شب خون، میرے خواب ریزہ ریزہ، جاناں جاناں، بے آواز گلی کوچوں میں، نابینا شہر میں آئینہ، سب آوازیں میری ہیں، پس اندازِ موسم، خوابِ گل پریشاں ہے، غزل بہانہ کروں، اے عشقِ جنوں پیشہ۔

لغت و توضیحات

تعارف (صفحہ نمبر 235)

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
درس و تدریس	پڑھانا	اکادمی ادبیات	ایک سرکاری ادارہ
نیشنل بک فاؤنڈیشن	ایک سرکاری ادارہ	سہلِ ممتنع	اتنے آسان اور سادہ الفاظ میں شعر کہنا کہ اس سے زیادہ آسان کہنا ممکن نہ ہو
ہلالِ امتیاز	حکومت سے ملنے والا ایک اعزاز	مرتسم کرنا	نقش کرنا
شگفتگی	خوش دلی، خوش مزاجی	تفکر	غور و فکر

Geniusnesthub.com

CamScanner

اشعار کی تشریح

(۱)

لب کشا لوگ ہیں، سرکار کو کیا بولنا ہے   اب لہو بولے گا تلوار کو کیا بولنا ہے

لغت: لب کشا: بول رہے ہیں۔

مفہوم: اب لوگوں میں بولنے کی ہمت پیدا ہو گئی ہے، اس لیے حکومت کو اب خاموش ہونا پڑے گا۔

تشریح

احمد فراز کی شاعری کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ ان کے کلام میں شگفتگی کے ساتھ ساتھ قدرے تفکر بھی پایا جاتا ہے۔ سماجی ناانصافیوں پر احتجاج تقریباً ہر شاعر کا موضوع رہا ہے لیکن احمد فراز کے ہاں یہ رنگ سب سے جدا ہے۔

(تعارفی عبارت ہر شعر کی تشریح سے پہلے لکھی جا سکتی ہے)

یہ شعر مزاحمت کا اشارہ ہے۔ ظالم اور جابر حکمران عوام پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے رہتے ہیں۔ وہ ان کے حقوق غصب کر لیتے ہیں اور انھیں اس حال میں چھوڑ دیتے ہیں کہ ان کی زندگی موت سے بدتر ہو جاتی ہے۔ جہاں وہ روز جیتے ہیں اور روز مرتے ہیں۔ ظالم حکمران ان کی محنت کی کمائی ٹیکسوں کے نام پر چھین لیتے ہیں۔ جہاں کوئی اس ظلم کے خلاف ذرا سا بولنے کی جرأت بھی کرے تو اسے سخت سے سخت سزا دی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو جان بوجھ کر نشانہ عبرت بنایا جاتا ہے اور انھیں تاریک زندانوں میں دھکیل دیا جاتا ہے یا سولیوں پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو سچ بولنے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ ان کے آزادی اور سچ بولنے کا حق چھین لیتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے پھر لوگوں میں مزاحمت پیدا ہوتی ہے۔ پہلے لوگ ڈرے سہمے رہتے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ظلم و ستم بڑھتا جاتا ہے، لوگ مزاحمت پر اُتر آتے ہیں۔ وہ اپنا حق لینے کے لیے گھروں سے نکل آتے ہیں اور ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بقول ساحر لدھیانوی:

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے   خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

یہی شاعر اس شعر میں کہہ رہا ہے کہ اب لوگوں کے بولنے کی باری ہے۔ حکمران جو بولنا چاہتے تھے، وہ بول چکے ہیں۔ وہ جو کرنا چاہتے تھے، وہ کر چکے ہیں۔ اب صرف لوگ بولیں گے، ظلم کے خلاف، جبر کے خلاف اور گھٹن کے خلاف جو ان کے ذہن و دل پر مسلط ہے۔ جب وہ اس ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھائیں گے تو حکمرانوں کی آواز اس مزاحمت کی گونج میں دب جائے گی۔ اور حکمرانوں نے جو یہ تلواریں اُٹھا رکھی ہیں، یہ اپنا کام کر چکی ہیں۔ انھوں نے جتنے لوگوں کو مارنا تھا، مار دیا ہے۔ اب مرنے والوں کا خون بولے گا اور اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر پکار پکار احتجاج کرے گا۔ الغرض شاعر جو ہر ظالم اور جابر حکمران کے دور میں مزاحمتی شاعری کے ذریعے آواز اُٹھاتا رہا ہے، وہ کہنا چاہتا ہے کہ حکمرانوں نے آج تک جو ظلم و ستم ڈھائے ہیں، اب انھیں ان کا حساب دینا ہوگا۔ بقول ساحر لدھیانوی:

تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا   آج وہ کوچہ و بازار میں آ نکلا ہے

(۲)

بکنے والوں میں جہاں، ایک سے ایک آگے ہو   ایسے میلے میں، خریدار کو کیا بولنا ہے

مفہوم: جہاں سبھی بکنے کے لیے تیار بیٹھے ہوں، وہاں خریدار کے آگے بول کے کیا جا سکتا ہے۔

Geniusnesthub.com

تشریح

اس شعر میں شاعر قوم اور وطن کے غداروں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہر قوم کی طرح ہماری قوم کی تاریخ بھی غداروں اور ضمیر فروشوں سے بھری پڑی ہے۔ جو دولت، اقتدار اور عیش و آرام کے لیے اپنی قوم و ملت سے غداری اور غیروں کے ساتھ وفاداری کرتے رہے ہیں۔ ایسے لوگ معمولی سے معمولی قیمت کے لیے بھی اپنی قوم کی عزت و ناموس کا سودا کرنے سے باز نہیں آتے۔ یہ کبھی حکمرانوں کی شکل میں قوم کے مفادات کے خلاف چلتے ہیں، کبھی بااختیار افسروں کی شکل میں دشمن کو معلومات پہنچاتے ہیں اور کبھی یہ طاقت ور ہونے کے سبب غیروں کے ساتھ مل کر اقتدار پر قبضہ جماتے ہیں۔ یہ اپنوں کی پشت پر اس وقت چھرا گھونپتے ہیں جب وہ دشمن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ سقوط بغداد سے لے کر سقوط ڈھاکہ اور آج کے دور تک، ایسے ننگ ملت اور غداروں کی ایک طویل فہرست ہے جو غیروں کے ہاتھوں بکنے کے لیے تیار ہو گئے۔ بقول عدیم ہاشمی:

اس نے کہا کہ ہم بھی خریدار ہو گئے بکنے کو سارے لوگ ہی تیار ہو گئے

اس شعر میں شاعر انھیں غداروں اور ضمیر فروشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب ایک سے بڑھ کے ایک آدمی بکنے کے لیے تیار بیٹھا ہے، چاہے وہ معمولی سے معمولی قیمت ہی پر کیوں نہ ہو۔ ہر کوئی اپنے ضمیر کی قیمت لگوانے کے لیے تیار ہے۔ تو اصول یہ ہے کہ جب منڈی میں بکنے والی چیزیں زیادہ ہوں تو پھر ان کی قیمت کے لیے زیادہ بحث و تکرار نہیں کی جاتی۔ ہر دکان دار یہ چاہتا ہے کہ اس کی چیز جس کسی بھی قیمت پر بک سکے، اسے بیچ دیا جائے۔ یوں چیزوں کی قیمتیں کم ہو جاتی ہیں۔ اسے طلب و رسد کا اصول کہا جاتا ہے۔ شاعر یہی کہتا ہے کہ ہر کوئی اپنے ضمیر کو بازار میں بیچنے کے لیے موجود ہے، ایسے حالات میں کسی خریدار کے آگے کیا بولا جائے اور قیمت کے لیے کیا بحث کی جائے۔ بقول داغ دہلوی:

دل رکھ تو دیا ہے نگہِ یار کے آگے اُف کر نہیں سکتا ہوں خریدار کے آگے

(۳)

لو چلے آئے عدالت میں گواہی دینے مجھ کو معلوم ہے، کس یار نے، کیا بولنا ہے

مفہوم: جنھیں عدالت میں گواہی دینے کے لیے میرے خلاف بلایا گیا ہے، مجھے معلوم ہے کہ وہ کیا بولیں گے۔

تشریح

اس شعر میں شاعر پھر ایک بار ضمیر فروشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ لوگ کبھی سچ نہیں بولیں گے، انھیں اگر گواہی دینے کے لیے بھی بلایا جائے تو یہ اسی کی زبان بولیں گے، جس نے ان کے ضمیر پہلے ہی سے خرید رکھیں ہیں۔ اس دنیا میں انصاف قائم کرنے میں ایک بڑا ہاتھ گواہی دینے والوں کا ہے۔ اس لیے قرآن گواہی دینے والوں کو سختی سے حق کے لیے گواہی دینے کی تلقین کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ گواہی دینے والوں کو تاکید کرتا ہے کہ جو کچھ بھی ہو جائے، وہ حق سے نہ پھریں، خواہ انھیں اپنے بہن بھائیوں یا گھر والوں کے خلاف ہی کیوں نہ گواہی دینی پڑی کیوں کہ انصاف کے فیصلے انھی گواہیوں کے بنیاد پر دیے جاتے ہیں۔ اگر لوگ جھوٹی گواہی دیں گے تو پھر معاشرے میں کبھی انصاف قائم نہیں ہو سکے گا اور جس معاشرے میں انصاف قائم نہیں رہ سکے گا، وہ تباہ ہو جائے گا۔

شاعر کہتا ہے کہ یہ جو لوگ اس کے خلاف گواہی دینے کے لیے آئے ہیں، یہ سب اپنے ضمیر دولت کے لیے بیچ چکے ہیں۔ ان سب نے

Geniusnesthub.com
CamScanner

چند ٹکوں کے لیے حق اور انصاف کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اس لیے مجھے معلوم ہے کہ یہ لوگ عدالت میں آ کر کیا کہیں گے۔ گویا شاعر جانتا ہے کہ جو لوگ ضمیر فروش ہیں، ان کے زبانوں سے کبھی سچ بات نہیں نکلے گی۔ وہ ہمیشہ وہی بولیں گے جو بولنے کے لیے انھیں خریدا گیا ہے۔ اس لیے شاعر کو یقین ہے کہ اس معاملے میں کبھی انصاف قائم نہیں ہو سکے گا۔ جو بھی ہوگا، وہ ظلم اور جبر ہی ہوگا۔ ایک شاعر عزیز الرحمن نے ایسے ہی لوگوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا تھا:

ضمیر بیچنے والے وہ تیرا سوداگر ضمیر ہی نہیں، ذات و صفات لے کے گیا

(۴)

اور کچھ دیر رہے گوش بر آواز ہَوا پھر چراغ سرِ دیوار کو کیا بولنا ہے

لغت: گوش بر آواز: آواز سننے کی منتظر۔ چراغ سرِ دیوار: دیوار پر رکھے ہوا چراغ۔

مفہوم: ابھی ہوا کچھ دیر اور میرے بجھنے کی آواز کی منتظر رہے، میں جب بجھ جاؤں گا تو پھر خاموش ہو جاؤں گا۔

تشریح

اس شعر میں شاعر اپنے لیے چراغ کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ جب تک بجھ نہیں جاتا، روشنی پھیلاتا رہے گا۔ چراغ کا کام روشنی پھیلانا اور اندھیرے کے خلاف مزاحمت کرنا ہے۔ شاعر خود کو چراغ سے تشبیہ دیتا ہے جو اس ظلم اور جبر کے دور میں ظالموں کے خلاف مزاحمت کی علامت ہے اور لوگوں کو شعور دینے کی تحریک ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگرچہ وہ بھی بجھنے والا ہے لیکن جب تک وہ جلتا رہے گا، تب تک وہ روشنی پھیلاتا رہے گا۔ بقول احمد فراز:

اگرچہ زور ہواؤں نے ڈال رکھا ہے مگر چراغ نے لَو کو سنبھال رکھا ہے

شاعر جو جو ہر ظالم اور جابر کے دور میں مزاحمتی شاعری کی دیا جلاتا رہا ہے، اس شعر میں پیغام دے رہا ہے کہ ابھی ہوا کو اس کے بجھنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ لیکن جب تک وہ جلے گا، وہ اس گھر کو روشن کرتا رہے گا۔ ظالم حکمران ایسے لوگوں کو کبھی برداشت نہیں کرتے، ان کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ لوگ خاموش ہو جائیں۔ اس کے لیے وہ ہر ہر حربہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ ایسے لوگوں صفحہ ہستی سے تک مٹانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن شاعر اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ جب تک وہ زندہ ہے، چراغ کی طرح جلتا رہے گا۔ وہ ظلم اور ناانصافی کے خلاف احتجاج اور مزاحمت جاری رکھے گا۔ اس لیے ابھی ہوا میرے بجھنے کی آواز سننے کے لیے منتظر رہے۔ الغرض شاعر مرتے دم تک ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز اُٹھانے کا عزم رکھتا ہے اور دراصل یہی چراغ ہیں جن سے کچھ نہ کچھ روشنی باقی رہتی ہے۔ بقول ابرار احمد:

کہیں کوئی چراغ جلتا ہے کچھ نہ کچھ روشنی رہے گی ابھی

(۵)

مجھ سے کیا پوچھتے ہو، آخری خواہش میری اِک گناہ گارِ سرِ دار، کو کیا بولنا ہے

لغت: گناہ گارِ سرِ دار: پھانسی چڑھنے والا گناہ گار۔

مفہوم: مجھ سے میری آخری خواہش کیا پوچھتے ہو کیوں کہ جو شخص ناکردہ گناہ کے جرم میں پھانسی چڑھنے والا ہو، وہ کیا بتائے گا۔

Geniusnesthub.com
CamScanner

تشریح

اس شعر میں شاعر ظلم اور جبر کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے کہتا ہے کہ اس دور میں حق بیان کرنے کا جرم یہ ہے کہ اسے پھانسی چڑھا دیا جائے۔ چوں کہ ہر پھانسی چڑھنے والے شخص سے اس کی آخری خواہش بھی پوچھی جاتی ہے، اس لیے شاعر سے بھی اس کی آخری خواہش پوچھی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ ساری زندگی حق اور سچ کے لیے آواز اٹھاتا رہا ہے۔ اس نے کبھی جھوٹ اور ظلم کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ ان کے خلاف مزاحمت کرتا رہا ہے۔ اسی جرم میں اسے گرفتار کیا جاتا ہے اور پھانسی کی سزا سنا دی جاتی ہے۔ اب پھانسی چڑھانے سے پہلے اس سے جب آخری خواہش پوچھی جاتی ہے تو وہ حیران ہوتا ہے کہ کیا وہ نہیں جانتے کہ اس کی آخری خواہش کیا ہے۔ جس سچ اور انصاف کے لیے اسے پھانسی چڑھایا جا رہا ہے، وہی اس کی آخری خواہش ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں سچ اور انصاف کا بول بالا ہو۔ ہر شخص کو اس کا حق ملے۔ معاشرے میں ظلم اور ناانصافی نہ ہو۔ یہی وہ جرم تھا جس کے لیے اسے پھانسی کا سزاوار ٹھہرایا گیا۔ کیا اب ظالم حکمران میری آخری خواہش کے طور پر اسے پورا کریں گے؟ ہرگز نہیں۔ اس لیے شاعر کہتا ہے کہ مجھ ایسے آدمی سے آخری خواہش پوچھنے کی کیا تک ہے۔ میں تو وہی چاہوں گا جو پہلے چاہتا تھا۔ الغرض وہ چاہتا ہے کہ ظالم حکمران اس کے ساتھ اس طرح کے تکلف نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی بات پہلے بھی نہیں مانی گئی تھی اور اب بھی نہیں مانی جائے گی کیوں کہ یہ ظالموں اور جابروں کے حق میں نہیں ہے۔ اگر وہ مظلوم کو اس کا حق دے دیں گے تو پھر ان کی اپنی خواہشیں اور خواہشات پورے نہیں ہو سکیں گے۔ اس لیے وہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ معاشرے میں انصاف کا بول بالا ہو اور ہر کسی کو اس کا حق ملے۔ قتیل شفائی نے کہا تھا:

کون اس دیس میں دے گا ہمیں انصاف کی بھیک — جس میں خونخوار درندوں کی شہنشاہی ہے

(۶)

خلقتِ شہر تھی چُپ، شاہ کے فرمان کے بعد — اب کسی واقفِ اَسرار کو کیا بولنا ہے

لغت: خلقتِ شہر: شہر کے لوگ۔ واقفِ اَسرار: جو راز جانتا ہو۔

مفہوم: شہر کے لوگ بادشاہ کے حکم کے بعد خاموش ہیں۔ ایسے میں جو راز جاننے والے بھی ہیں، وہ بھی خاموشی ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔

تشریح

اس شعر میں شاعر ظلم اور جبر کا نقشہ کھینچ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بادشاہ نے پورے شہر میں ایک فرمان جاری کر دیا ہے کہ کوئی اس کے کسی حکم اور عمل پر سوال نہیں اُٹھا سکتا اور جو ایسا کرے گا، وہ سزا پائے گا۔ یہی وہ ظلم اور جبر ہے جس کی طرف شاعر اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان چوں کہ فطرتاً کمزور اور کم ہمت واقع ہوا ہے، اس لیے بادشاہ کے حکم کے بعد لوگ سچ بولنے سے گریز کر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر سچ بولا جائے گا تو پھر اس کی سزا بھی انھیں بھگتنی پڑے گی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو بہت سے راز جاننے والے ہیں، وہ بھی خاموش ہو چکے ہیں کیوں کہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ پھر وہ ظلم اور جبر کا نشانہ بنے گا۔ اقبال نے ایسے ہی دور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں — یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

(دستورِ زباں بندی: زبان بند رکھنے کا قانون مراد خاموش رہنا)

شاعر بھی ایسے ہی ظلم اور جبر کے دور میں جی رہا ہے۔ جب ہر طرف دستورِ زباں بندی ہے اور آواز اٹھانے والوں کو سخت سزائیں دی

Geniusesthub.com
CamScanner

جاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہر طرف ڈر اور خوف کے پہرے ہیں۔دراصل ہر ظالم اور جابر کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ لوگوں میں خوف کے گہرے سائے پھیلا دیے جائیں۔کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اگر لوگوں کو سچ بولنے کی اجازت دی گئی تو پہلے لوگوں میں ظلم کے خلاف باتیں ہوں گیں اور پھر لوگ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔اس لیے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر شخص زبان بند رکھے۔کسی کو سچ بولنے یا تنقید کرنے کا اختیار نہ ہو۔پرانے وقتوں سے لے کر آج کے جدید زمانے تک ہر حکمران اپنے ظلم اور ناانصافی پر پردہ ڈالنے کے لیے سخت سے سخت سنسر شپ اور قانون بناتا ہے تاکہ لوگ اس کے تابع رہ سکیں۔ناصر کاظمی نے ایسے ہی ظلم اور جبر کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا:

اے ہم سخن وفا کا تقاضا ہے اب یہی
میں اپنے ہاتھ کاٹ لوں، تو اپنے ہونٹ سی

(۷)

وہی جانے پسِ پردہ ، جو تماشاگر ہے
کب، کہاں، کون سے کردار کو کیا بولنا ہے

لغت: پسِ پردہ: پردے کے پیچھے۔تماشاگر: تماشا دکھانے والا

مفہوم: جو تماشا دکھانے والا ہے، وہی جانتا ہے کہ پردے کے پیچھے کیا ہو رہا ہے اور کب اور کہاں کس کردار نے کیا بولنا ہے۔

تشریح

اس شعر میں شاعر ان ظالم اور جابر حکمرانوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو پردے کے پیچھے رہ کر تماشا دکھاتے ہیں اور ہر کردار کی زبان اور عمل کی ڈوریاں ان کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔دیکھا جائے تو ہمارے ملک اور دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، ہم ان میں سے اکثر کی حقیقت سے کبھی واقف نہیں ہو پاتے۔بظاہر ایک واقعہ ہوتا ہے جسے ہم جانتے ہیں، لیکن درحقیقت ہم اس کی اصل سے ناواقف ہوتے ہیں۔پردے کے پیچھے کیا ہے؟ یہ ہمارے لیے ہمیشہ راز ہی رہتا ہے۔تماشا دکھانے والے جو کرداروں کو استعمال کرتے ہیں اور ان کی ڈوریاں ان کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں، وہی پردے کے پیچھے کیا ہے، سے واقف ہوتے ہیں۔وہی جانتے ہیں کہ کب اور کہاں کس کردار نے کیا بولنا ہے اور کیا عمل کرنا ہے۔مرزا احسان بیگ نے اسی بے اختیاری پر احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا:

کچھ نہیں اختیار میں پھر بھی
ہر خطا میری ہر قصور مرا

دراصل شاعر اس ظلم اور جبر کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو حکمرانوں نے برپا کر رکھا ہے۔وہ اس ظلم اور جبر پر پردہ ڈالنے کے لیے کچھ نہ کچھ تماشے تخلیق کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگوں میں ان کے خلاف بغاوت کے خیالات پیدا نہ ہوں۔کبھی وہ اپنے ظلم اور جبر کو خوب صورت بنا کر پیش کرتے ہیں اور کبھی وہ اپنے کسی ایک عمل کو چھپانے کے لیے دوسرا تماشا دکھاتے ہیں جس سے لوگوں کی توجہ اصل بات سے ہٹ کر دوسری طرف مرکوز ہو جاتی ہے۔دنیا بھر میں حکمران اپنی نااہلیوں اور جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔اس لیے وہ ہر تماشے کے کرداروں اور پردے کے پیچھے ہونے والے واقعات سے اچھی طرح آگاہ ہوتے ہیں۔الغرض شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، ہم صرف اسے کے ظاہر ہی سے آگاہ ہوتے ہیں لیکن تماشا دکھانے والے پردے کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقتوں کو بھی جانتے ہیں۔غالب نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

(کواکب: ستارے)

Geniusnestlhub.com
CamScanner

(۸)

جہاں دربار ہوں شاہوں کے، مصاحب ہوں فرازؔ وہاں غالب کے، طرف دار کو کیا بولنا ہے

لغت: مصاحب: دوست، ساتھ بیٹھنے والے۔ طرف دار: حمایتی۔

مفہوم: جن درباروں میں عزت بادشاہوں کے مصاحبوں کو ملتی ہو، وہاں غالب جیسے شاعر کے حمایتی کیا بولیں گے۔

تشریح

اس شعر میں شاعر بتانا چاہتا ہے کہ دنیا میں عزت بھی انھیں ملتی ہے جنھیں بادشاہوں کا مصاحب ہونے کا اعزاز حاصل ہو۔ یعنی یہاں عزت کا معیار ہنر نہیں بلکہ بادشاہ کے قریب ہونا ہے۔ عموماً دنیا میں حکمرانی کو عزت کا بلند ترین معیار سمجھا جاتا ہے اور جو لوگ حکمرانوں سے قریب ہوتے ہیں، وہ بھی عزت دار کہلاتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ لوگ ہنر مند بھی ہوں۔ عام طور پر یہ لوگ خوشامدی، موقع پرست اور چڑھتے سورج کو سلام کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ حکمرانوں کی بے جا تعریفیں اور ہر بات میں ہاں میں ہاں ملا کر ان سے قریب ہو جاتے ہیں۔ پھر یہی موقع پرست بڑے بڑے عہدوں پر بھی مقرر کیے جاتے ہیں۔ لوگ بھی ان کی عزت کرتے ہیں۔ اسی لیے ایک شاعر نے شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا:

جھکنے والوں نے رفعتیں پائیں ہم خودی کو بلند کرتے رہے

(رفعتیں: بلندیاں۔ خودی: انا، ذات، کردار)

شاعر بھی اس شعر میں یہی شکوہ کر رہا ہے کہ جن درباروں میں عزت کا معیار یہ ہو کہ جو بادشاہ کے قریب تر ہو گا، وہی عزت دار ہے۔ وہی اہلِ ہنر میں سے ہے۔ وہاں ایک حقیقی اہلِ ہنر غالب کے طرف دار کیا بولیں گے۔ گویا وہ کہنا چاہتا ہے کہ منزلیں انھیں ملتی ہیں جو لوگ خوشامد اور موقع پرست ہوتے ہیں اور اہلِ ہنر اپنے ہنر کے باوجود پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بقول محسن بھوپالی:

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھیے منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

(نیرنگیٔ سیاستِ دوراں: زمانے کے انقلاب یا تبدیلی)

مشق

ا۔ دی گئی غزل کے مطابق درج ذیل سوالوں کے جواب لکھیں۔

ا۔ "اَب لہو بولے گا" سے کیا مراد ہے؟

جواب: اس سے مراد یہ ہے کہ جہاں ظلم اور ناانصافی عام ہو جائے، جہاں سچ بولنا جرم ٹھہرے، وہاں آخر کار لوگ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ یہ پروا نہیں کرتے کہ انھیں سزا ملے گی یا انھیں مار دیا جائے گا بلکہ وہ اس ظلم کے خلاف نکل پڑتے ہیں۔

ب۔ "ہوا کے گوش بر آواز" سے کیا مراد لی گئی ہے؟

جواب: شاعر اپنے لیے چراغ کا استعارہ استعمال کرتا ہے۔ وہ خود کو چراغ سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کا کام روشنی پھیلانا ہے۔ جب تک وہ جلتا رہے گا، وہ ظلم اور ناانصافی کے خلاف چراغ بن کر اپنی روشنی سے دنیا کو روشن کرتا رہے گا۔ اس لیے ہوا ابھی میرے بجھنے کی آواز سننے کا انتظار کرے۔

ج۔ خلقتِ شہر کیوں چپ تھی؟

جواب: خلقتِ شہر اس لیے چپ تھی کیوں کہ ظالم اور جابر حکمرانوں نے ہر اس آواز کو خاموش کرا دیا تھا جو ان کے خلاف اٹھی تھی۔ اس لیے لوگ خوف زدہ تھے اور ان کے خلاف کچھ بولتے ہوئے ڈرتے تھے۔

Geniusnesthub.com
CamScanner

د۔ شاعر نے آخری خواہش کیوں نہ بتائی؟

جواب: شاعر کے خیال میں اسے جس جرم میں پھانسی کی سزا سنائی جا رہی ہے، وہی اس کی آخری خواہش ہے۔ یعنی ظلم اور ناانصافی کو ختم کرنے کی خواہش۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ اسے اپنی آخری خواہش بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ اس غزل کی ردیف لکھیں۔

جواب: اس غزل کی ردیف ہے: ''کو کیا بولنا ہے''

۳۔ اس غزل کے قوافی لکھیں۔

جواب: اس غزل کے قوافی ہیں: سرکار، تلوار، خریدار، یار، دیوار، دار، اسرار، کردار، طرف دار

۴۔

بکنے والوں میں جہاں ایک سے ایک آگے ہو ایسے میلے میں خریدار کو کیا بولنا ہے

کلام میں کسی چیز کا ذکر کرنا اور پھر اُس کی مناسبت سے دوسری چیزیں لانا بشرطیکہ یہ چیزیں متضاد نہ ہوں مراعاۃ النظیر کہلاتا ہے۔ جیسے مندرجہ بالا شعر میں بکنے کی مناسبت سے میلے اور خریدار کا ذکر کیا گیا ہے۔ کم از کم تین ایسے اشعار لکھیں جن میں صنعتِ مراعاۃ النظیر کا استعمال ہو۔

جواب: مثالیں:

1۔ جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

اس شعر میں کھیت کی مناسبت سے دہقاں، روزی اور خوشہ گندم کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

2۔ شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

اس شعر میں نماز کی مناسبت سے امام، قیام اور سجود کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

3۔ چلتے ہو تو چمن کو چلیے، سنتے ہیں کہ بہاراں ہے پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں، کم کم بادو باراں ہے

اس شعر میں چمن کی مناسبت سے بہاراں، پات، پھول اور بادو باراں کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

۵۔ درج ذیل شعر کی تشریح کریں۔

جہاں دربار ہوں شاہوں کے مصاحب ہوں فراز وہاں غالب کے طرف دار کو کیا بولنا ہے

جواب: دیکھیے تشریحات

اضافی مختصر سوال جواب

سوال ۱: شاعر کے نزدیک کہاں خریدار کو بولنے کی ضرورت نہیں پڑتی؟

جواب: شاعر کے خیال میں جس میلے میں لوگ خود بکنے کے لیے تیار ہوں بلکہ ہر کوئی آگے بڑھ کر خود کو بیچ رہا ہو، وہاں خریدار کو کچھ بولنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

سوال ۲: شاعر کے خیال میں کسی واقفِ اسرار کو بولنے کی ضرورت کیوں نہیں پڑتی؟

جواب: شاعر کے خیال میں جب حکمران چپ رہنے کا قانون نافذ کر دیں اور بولنے والوں کو زیادہ سے زیادہ سزائیں دی جائیں تو وہاں واقفِ اسرار کو بھی چپ رہنا پڑتا ہے۔

Geniusnesthub.com
CamScanner

سوال ۳: شاعر کے نزدیک وہ کون ہے جو پسِ پردہ معاملات کے بارے میں بھی جانتا ہے؟

جواب: شاعر کے نزدیک جو تماشا گر ہوتا ہے وہی پردے کے پیچھے معاملات سے آگاہ ہوتا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کس کردار کو کب، کہاں اور کیا بولنا ہے۔

اضافی کثیر الانتخابی سوالات

☆ ہر سوال کے چار ممکنہ جوابات (ا، ب، ج، د) دیئے گئے ہیں، درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

-1 احمد فراز کا سنِ پیدائش ہے:

ا۔ ۱۹۳۲ء ب۔ ۱۹۳۳ء ج۔ ۱۹۳۴ د۔ ۱۹۳۵

-2 احمد فراز کا سنِ وفات ہے:

ا۔ ۲۰۰۸ء ب۔ ۲۰۰۹ء ج۔ ۲۰۱۰ء د۔ ۲۰۱۱ء

-3 احمد فراز کہاں پیدا ہوئے؟

ا۔ لاہور ب۔ کراچی ج۔ ملتان د۔ کوہاٹ

-4 وہ کس ادارے کے سربراہ رہے؟

ا۔ ثقافتِ اسلامیہ ب۔ مجلسِ اقبال ج۔ مجلسِ ترقی ادب د۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن

-5 ۲۰۰۴ء میں نے انھوں نے کون سا اعزاز واپس کر دیا تھا؟

ا۔ ہلالِ امتیاز ب۔ ہلالِ ادب ج۔ ہلالِ شاعری د۔ ہلالِ غزل

-6 شاعر کے نزدیک جب لہو بولے گا تو کسے چپ رہنا پڑے گا؟

ا۔ تیر کو ب۔ بندوق کو ج۔ توپ کو د۔ تلوار کو

-7 جہاں بکنے والے بڑھ چڑھ کر بکنے والے تیار ہوں، وہاں کسے بولنے کی ضرورت نہیں رہتی؟

ا۔ لوگوں کو ب۔ خریدار کو ج۔ زمانے کو د۔ دشمنوں کو

-8 پسِ پردہ کے بارے میں کون جانتا ہے؟

ا۔ کردار ب۔ لوگ ج۔ تماشائی د۔ تماشا گر

-9 شاہوں کے دربار میں کس کے طرف دار کو بولنے کی ضرورت نہیں رہتی؟

ا۔ میر تقی میر ب۔ غالب ج۔ اقبال د۔ فیض

جوابات

-1	ب	-2	ا	-3	د	-4	د	-5	ا
-6	د	-7	ب	-8	د	-9	ب		

Geniusnesthub.com
CamScanner

ظفر اقبال

(1923)

تعارف:

تخلیقی سفر: اوکاڑہ میں ہونے والے ظفر اقبال کی شاعری کا سفر نصف صدی سے زیادہ ہے۔ ابتدا میں وہ غزل کی روایات کے کبھی قریب اور کبھی دور ہوئے۔ آخر کار غزل کی روایات کے سحر سے آزاد ہو گئے لیکن اس سفر میں اُنھیں کڑے مراحل سے گزرنا پڑا، اُردو ادب کا عام قاری اور تخلیق نگار اُردو غزل کی روایات کا ایسا اسیر ہے کہ وہ اس طلسمی فضا سے باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ گزشتہ صدیوں میں حالی اور انشاء نے غزل کی روایات کو توڑنے کی کوشش ضرور کی لیکن ان کوششوں کی بنا پر غزل میں کیا تبدیلی آتی، اُردو غزل میں حالی اور انشا اپنے مقام سے محروم ہو گئے۔

ادبی خدمات: ظفر اقبال کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے غزل کی صدیوں پرانی روایتی فضا اور غزل کی موروثی جمالیات کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اُنھیں بجا طور پر بیسویں صدی کا ادبی مرتد اور روایتی غزل کی غلامی سے آزاد ہونے والا پہلا شاعر کہا ہے۔

مجموعہ ہائے کلام: تمجید، تقویم، شکیل، تجاوز، توارد، تسابل، آبِ رواں، گلافتاب، ہے ہنومان، رطب و یابس، اب تک (کلیات)

لغت و توضیحات

تعارف (صفحہ نمبر 237)

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
سحر	جادو	کڑے مراحل	سخت مرحلے
اسیر	کسی چیز کا قیدی یا گرفتار ہونا	طلسمی فضا	جادوئی فضا
روایتی فضا	ایسی فضا جس میں روایات پر عمل کیا جاتا ہے	موروثی جمالیات	جو حسن و جمال وراثت میں ملا ہو
ادبی مرتد	پرانی ادبی روایات سے منحرف ہونے والا یا راستہ بدلنے والا		

اشعار کی تشریح

(ا)

مل کے بیٹھے نہیں، خوابوں میں شراکت نہیں کی
اور کیا رشتہ ہو تجھ سے جو محبت نہیں کی

لغت: شراکت: کسی چیز میں شریک ہونا۔

مفہوم: میں نے اگر تم سے محبت نہیں کی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں کبھی تم سے قریب نہیں رہا اور نہ ہی ہمارے خواب مشترک ہیں۔

Geniusnesthub.com
CamScanner

+ تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا:

تشریح

ظفر اقبال جدید شاعروں میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے غزل کی صدیوں پرانی روایتی فضا اور غزل کی موروثی جمالیات کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا ہے۔

(تعارفی عبارت ہر شعر کی تشریح سے پہلے لکھی جا سکتی ہے)

اس شعر میں شاعر محبت نہ کرنے کی وجہ بتا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے اگر محبت نہیں کی تو اس کی چند وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کبھی اس کے قریب نہیں رہا اور دوسرا یہ کہ کبھی ان دونوں کے خواب مشترک نہیں تھے۔ دراصل محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو محبوب کے قریب رہنے سے زندہ رہتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنا اس تعلق کو جوان رکھتا ہے۔ انسان کے ہر رشتے میں یہ حقیقت پنہاں ہے کہ محبت قربت مانگتی ہے۔ جب دو لوگ ایک دوسرے کے قریب رہتے ہیں تو دراصل محبت کی دھیمی دھیمی آگ سلگتی رہتی ہے۔ جو اس رشتے یا تعلق کو قائم رکھتی ہے۔ لیکن شاعر کسی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ان کے درمیان کبھی ایسی قربت رہی ہی نہیں ہے تو پھر ان کے درمیان محبت کا یہ تعلق کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ جون ایلیا نے کہا تھا:

یہ کافی ہے کہ ہم دشمن نہیں ہیں　　وفاداری کا دعویٰ کیوں کریں ہم

دوسرا شاعر کہتا ہے کہ ہمارے درمیان کوئی خواب بھی مشترک نہیں۔ اگر دو لوگوں کے درمیان خواب مشترک ہوں تو یہ بھی محبت کے تعلق کی بنیاد بن جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں اور اس طرح محبت کا تعلق پروان چڑھتا ہے۔ اسی لیے شاعر کہتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی بھی تعلق یا رشتہ موجود ہی نہیں۔ اس لیے ان کے رمیان محبت کا جذبہ کیسے پروان چڑھ سکتا ہے۔

(۲)

یہیں پھرتے ہیں شریف آدمیوں کی صورت　　دشت میں خاک اُڑائی نہیں، وحشت نہیں کی

لغت: دشت: صحرا۔ وحشت: جنون، دیوانگی۔

مفہوم: میں تو اسی طرح شہر میں شریف لوگوں کی طرح رہتا ہوں، میں نے کبھی دیوانوں کی طرح صحرا میں جا کر خاک نہیں اُڑائی یا دیوانگی کا اظہار نہیں کیا۔

تشریح

اس شعر میں شاعر اُردو شاعری کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ تو عام لوگوں کے درمیان شریف لوگوں کی طرح رہتا ہے، اس نے کبھی بھی دیوانگی یا پاگل پن کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی مجنوں کی طرح صحرا میں جا کر خاک اُڑائی ہے۔ دراصل اُردو شاعری میں مجنوں کا کردار تلمیح کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جو عشق میں دیوانگی کی حد تک جا پہنچا تھا اور صحرا میں مارا مارا پھرتا رہتا تھا۔ اسی روایت کے پس منظر میں اُردو شاعری میں بہت سے اشعار کہیں گے ہیں۔ جن میں صحرا کی طرف جانے اور خاک اُڑانے کا ذکر ہے۔ ایوب رومانی کا مشہور شعر ہے:

جب بہار آئی تو صحرا کی طرف چل نکلا　　صحنِ گل چھوڑ گیا، دل میرا پاگل نکلا

لیکن شاعر اس روایت سے انحراف کرتا ہوئے کہتا ہے کہ اس نے بھی محبت کی ہے لیکن وہ عام شریف لوگوں کی طرح ہی شہر میں رہتا ہے۔ جیسے سب زندگی گزارتے ہیں، وہ بھی گزارتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ محبت اور عشق میں بے تابی یا بے قراری نہیں ہوتی لیکن اس نے کبھی

Geniusnesthub.com

CamScanner

بھی اپنی اس وحشت کا اظہار نہیں کیا۔ گویا شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس کا حال ان دیوانوں جیسے نہیں ہے، جو صحرا کی خاک اُڑاتے پھرتے تھے اور اپنی دیوانگی کا اظہار کرتے تھے۔

(۳)

خاص ہم سے تو کوئی تھا ہی نہیں تیرا سلوک　　　اور ہم نے بھی ترے ساتھ رعایت نہیں کی

مفہوم: اے محبوب جس طرح تو نے مجھ سے کوئی خاص سلوک نہیں کیا، اسی طرح میں نے بھی تمھارے ساتھ کوئی رعایت نہیں رکھی۔

تشریح

اس شعر میں شاعر محبوب کی بے رخی کا جواب بے رخی سے دے رہا ہے۔ اُردو کی شعری روایت میں محبوب کے ظلم اور جفا کے جواب میں عاشق ہمیشہ عاجزی اور منت سماجت کا رویہ رکھتا ہے۔ وہ محبوب کی بے رخی دیکھ کر تڑپ اُٹھتا ہے اور اس کے در پر جا کے پتھروں سے سر پھوڑتا ہے تاکہ کسی طرح محبوب کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو سکے۔ وہ اس پر لطف و کرم کرے لیکن محبوب کبھی اس پر مہربان نہیں ہوتا۔ عاشق ہمیشہ اس کے سامنے منت سماجت کرتا رہتا ہے لیکن محبوب کے پتھر دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

لیکن شاعر اس روایت کو توڑتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر محبوب ہماری بات سننے کے لیے تیار نہیں تو ہم بھی اس سے کوئی بات کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر وہ اپنی بے رخی کو بدلنا نہیں چاہتا تو شاعر بھی اس سے کوئی رعایت نہیں کرے گا اور اس سے ویسے ہی بے رخی سے پیش آئے گا۔ وہ ایسا نہ سمجھے کہ پرانے عاشقوں کی طرح وہ بھی اس کی منت سماجت کرے گا اور اس کے در پر جا کے پڑا رہے گا۔ اسے جان لینا چاہیے کہ ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔ الغرض شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ محبوب کی بے رخی کا جواب بھی بے رخی ہی سے ملے گا۔ بقول غلام مولیٰ قلق:

تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی　　　تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

(۴)

پوچھ لیتے کبھی تیرا بھی ارادہ تجھ سے　　　ہم نے چاہا تو کئی بار تھا، ہمت نہیں کی

مفہوم: میں نے چاہا تھا کہ تم سے بھی پوچھ لوں لیکن ہمت کے باوجود تم سے پوچھ نہ سکا۔

تشریح

اس شعر میں شاعر اپنی کم ہمتی کا حال بیان کر رہا ہے کہ وہ کبھی محبوب کے دل کی بات نہ جان سکا۔ دراصل شاعر نے محبت کی تھی اور اس کے دل میں اس کے محبوب کا گھر تھا۔ وہ اپنے دل کی کیفیت تو بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اپنے محبوب سے بہت بے حد محبت کرتا ہے لیکن ضروری یہ تھا کہ محبوب کے دل کا حال بھی جان لیا جائے۔ شاعر اسی بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ کبھی اس بات کو پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکا۔

دراصل شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ وہ عمر بھر یک طرفہ محبت میں گرفتار رہا اور اسی کشش و پنج میں رہا کہ خدا جانے محبوب کے دل میں بھی یہی احساس موجود ہے یا نہیں۔ اگر وہ جان لیتا تو شاید وہ اس کشمکش سے باہر نکل آتا۔ وہ محبوب سے اپنے دل کا حال کہہ دیتا تو شاید اس کے اپنے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو جاتا اور پھر اگر محبوب بھی اس سے محبت کرتا ہوتا تو کم از کم یہ محبت دو طرفہ ہو جاتی اور پھر اس کا انجام بخیر ہوتا۔ لیکن شاعر اپنی کم ہمتی کے سبب یہ جان ہی نہ سکا کہ محبوب کے دل میں کیا ہے۔ اس لیے وہ ایک قسم کے پچھتاوے کا شکار ہے کہ وہ کبھی اس معاملے میں ہمت نہ کر سکا۔ بقول ناصر کاظمی:

کچھ نہ کہا اور کچھ نہ سنا　　　دل میں رہ گئی دل کی بات

Geniusnesthub.com
CamScanner

(۵)

بہت اچھا بھی لگا تُو، ہمیں اُس محفل میں ہم نے دانستہ وہاں تیری حمایت نہیں کی

لغت: دانستہ: جان بوجھ کر۔

مفہوم: اے محبوب! اگرچہ اس محفل میں ہمیں تو سب سے زیادہ عزیز تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر تیری حمایت نہیں کی۔

تشریح

اس شعر میں شاعر محبوب کی حمایت نہ کرنے کی وجہ بیان کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس محفل میں جتنے بھی لوگ شریک تھے، اے محبوب سب سے زیادہ عزیز تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر اس کی حمایت نہیں کی کیوں کہ اس طرح سب لوگ اس کے دل کے حال سے آگاہ ہو جاتے۔ دراصل شاعر کے دل میں محبوب کا جو مقام ہے، وہ اس نے ساری دنیا سے پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ وہ اسے لوگوں کے سامنے ظاہر نہیں کرتا۔ کیوں کہ لوگ پھر طرح طرح کی باتیں بھی کرتے ہیں اور باتیں بناتے بھی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے محبوب کی عزت پر بھی حرف آتا ہو۔ اس لیے شاعر کہتا ہے کہ جہاں لوگوں کے سامنے کوئی معاملہ ہو تو وہ محبوب کی حمایت نہیں کرتا تا کہ لوگ اس کے دل کا حال نہ جان لیں۔

دراصل شاعر کی حمایت دیکھ کر لوگ یقین کر لیتے کہ ضرور دل میں کچھ کالا ہے۔ اس لیے شاعر محفل میں محبوب کے حوالے سے لیے دیے رہا۔ یعنی اس نے کوئی غیر ضروری بات اس کے لیے نہیں کی کیوں کہ ایک تو وہ نہیں چاہتا کہ لوگ اس کے دل کے حال سے واقف ہو جائیں اور دوسرا محبوب کی عزت پر کوئی حرف آئے۔ الغرض شاعر محبوب کو حقیقتِ حال بتاتے ہوئے، اس کی حمایت نہ کرنے کی اصل وجہ بیان کر رہا ہے۔ کچھ اسی قسم کی بات ابن انشا نے اپنی غزل کے دو اشعار میں کہی تھی:

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرا ترا

ہم بھی وہیں موجود تھے ہم سے بھی سب پوچھا کیے ہم ہنس دیئے ہم چپ رہے منظور تھا پردہ ترا

(۶)

ظرف اتنا بھی کشادہ نہیں اپنا، لیکن ہم نے، پیدا بھی ہوئی ہے تو شکایت نہیں کی

لغت: ظرف: حوصلہ۔ کُشادہ: وسیع۔

مفہوم: اگرچہ میرا ظرف اتنا وسیع نہیں ہے لیکن جہاں تک کسی شکایت کا معاملہ ہے، تو وہ میں نے نہیں کی۔

تشریح

اس شعر میں شاعر اپنی اعلیٰ ظرفی کو عاجزانہ انداز میں بیان کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگرچہ اس کا ظرف اتنا اعلیٰ نہیں کہ ہر ظلم اور ستم برداشت کرتا رہے اور شکوہ بھی نہ کرے۔ لیکن جہاں تک محبوب کا معاملہ ہے تو اسے اگر شکایت پیدا ہوا بھی تو اس نے نہیں کی۔ دراصل دیکھا جائے تو عشق و محبت کے کچھ تقاضے ہیں۔ محبوب جتنے بھی ظلم و ستم کرے، راہِ محبت میں جتنی بھی تکلیفیں آئیں، عاشق انھیں ہنس کر برداشت کرتا ہے۔ وہ ان تکلیفوں اور مصیبتوں پر شکوہ شکایت نہیں کرتا۔ یہی محبت کے آداب ہیں، جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا:

خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا ادب پہلا قرینہ ہے، محبت کے قرینوں میں

Geniusnesthub.com
CamScanner

شاعر بھی یہی کہتا ہے کہ اگرچہ وہ بہت عالی ظرف نہیں ہے۔ وہ بھی غم اور دکھ سے کمزور ہو جاتا ہے لیکن جہاں تک محبوب کی بے رخی اور محبت کی راہ میں آنے والی تکلیفوں کا معاملہ ہے، وہ انھیں برداشت کرتا ہے۔ اسے شکایت ہو بھی تو وہ شکایت نہیں کرتا۔ بقول عاطف:

محبت میں شکایت نہیں اچھی حقیقت میں حکایت نہیں اچھی

(۷)

یہ بھی سچ ہے کہ ترے ہم بھی سوالی نہ ہوئے اور، تُو نے بھی کبھی کوئی عنایت نہیں کی

لغت: سوالی: سوال کرنے والا۔ عنایت: کرم، مہربانی۔

مفہوم: یہ سچ ہے کہ ہم نے کبھی تمھاری طلب نہیں کی اور یہ بھی سچ ہے کہ تو نے بھی کبھی مہربانی نہیں کی۔

تشریح

اس شعر میں شاعر محبوب کی بے رخی کی شکایت کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سچ ہے کہ اس نے کبھی محبوب سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس نے کبھی دوسرے عاشقوں کی طرح محبوب کے در پر جا کر پتھروں سے سر نہیں پھوڑا۔ ورنہ تو اُردو شاعری میں عاشقوں کی روایت یہی ہے کہ وہ محبوب کے ہر طرح کے ستم کے باوجود اس کے در پر پڑے رہتے ہیں۔ محبوب لاکھ بے وفا ہو، ستم گر ہو، انھیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ وہ ہمیشہ محبوب کے سامنے اس کے کرم کے لیے سوالی رہتے ہیں۔

لیکن شاعر کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ اس نے کبھی محبوب کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا اور کبھی اس کے سامنے سوالی نہیں ہوا۔ لیکن معاملہ دراصل یہ ہے کہ شاعر کے اس رویے کی وجہ بھی دراصل محبوب ہی ہے۔ شاعر محبوب کی بے رخی کی شکایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ سچ ہے کہ وہ کبھی اس کے آگے سوالی نہیں ہوا لیکن اصل تو یہ ہے کہ محبوب نے عاشق پر کبھی نظرِ کرم ہی نہیں۔ محبوب اگر عاشق پر مہربان ہوتا اور اسے اپنے لطف و کرم سے نوازتا تو عاشق کے دل میں بھی محبوب کے لیے تڑپ پیدا ہوتی۔ وہ بھی اس کے لیے بے چین اور بے قرار ہوتا کہ محبت دوطرفہ معاملہ ہے۔ جس طرح تالی ہمیشہ دو ہاتھوں سے بجتی ہے، اسی طرح جب تک محبت کی دھیمی دھیمی آگ دونوں طرف برابر نہ لگی ہو، محبت لطف نہیں دیتی۔ الغرض شاعر روایتی شاعروں کے برعکس محبوب کے سامنے اپنی لاپروائی کی وجہ بیان کرتے ہوئے صاف طور پر کہتا ہے کہ اصل وجہ محبوب کی بے رخی ہی ہے۔ اگر محبوب مہربان ہوتا تو نوبت کبھی یہاں تک نہ پہنچتی۔ بقول جون ایلیا:

کیسے کہیں کہ تجھ کو بھی ہم سے ہے واسطہ کوئی تو نے تو ہم سے آج تک کوئی گلہ نہیں کیا

(۸)

ہو رہا ہے جو، اسی طرح سے ہونا تھا یہاں اس لیے ہم نے کسی بات پہ حیرت نہیں کی

مفہوم: جو ہو رہا ہے، یہی ہونا تھا، اس لیے میں نے کسی بات پر حیرت کا اظہار نہیں کیا۔

تشریح

اس شعر کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو تقدیر کا تصور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو کچھ ہماری تقدیر میں لکھا ہے، وہی ہو کے رہتا ہے۔ انسان اسے بدل نہیں سکتا۔ وہ لاکھ کوشش کرے لیکن اس کی تدبیر، تقدیر کے آگے ہار جاتی ہے۔ شاعر بھی اسی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ آج جو کچھ بھی ہو رہا

Geniusnesthub.com

ہے، وہ اس پر حیرت کا اظہار نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا یقین ہے کہ جو کچھ تقدیر میں لکھا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ کسی بات پر بھی حیران نہیں ہوتا کیوں کہ اس کے خیال میں یہی قسمت کا لکھا تھا۔ اسے تقدیر کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کے انداز سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یعنی شاعر یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے، وہ اس پر ناراضی اور حیرانی کی بجائے، اسے تسلیم کر لیتا ہے۔ اس کا یقین ہے کہ انسان ہونی کو بدل نہیں سکتا۔ الغرض شاعر کا ایمان تقدیر پر پوری طرح ہے۔ بقول عزیز حیدر آبادی:

زورِ قسمت پہ چل نہیں سکتا خامشی اختیار کرتا ہوں

دوسرا پہلو اس شعر کا یہ ہو سکتا ہے کہ شاعر کو پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ جو آج ہو رہا ہے، وہی ہو کے رہے گا۔ انسان یوں تو غیب کا علم نہیں رکھتا لیکن کچھ لوگ اپنے علم، تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر آنے والے وقت کے بارے میں اندازہ لگاتے ہیں۔ انھیں اندازوں کو پیش گوئی کہا جاتا ہے۔ یہ پیش گوئیاں یا پیش بینی صحیح یا غلط ہو سکتی ہیں۔ شاعر اپنے بارے میں یہی کہتا ہے کہ اس نے جو کچھ اندازہ لگایا تھا، وہی ہو رہا ہے، اس لیے اسے حیرت نہیں ہوتی کیوں کہ وہ پہلے ہی سے ان کے بارے میں سوچ چکا تھا۔ بقول عارف اشتیاق:

یہی ہونا تھا اور ہوا جاناں ہو گئے ہم جدا جدا جاناں

(۹)

جو میسر ہُوا، تھا وہ بھی زیادہ کہ ظفرؔ جو ملا ہی نہیں، اس کی کبھی حسرت نہیں کی

مفہوم: مجھے جو ملا ہے، وہ بھی زیادہ تھا، اس لیے میں نے کبھی اس چیز کی خواہش ہی نہیں کی جو مجھے ملا ہی نہیں۔

تشریح

اس شعر میں شاعر قناعت اور صبر و شکر کا اظہار کر رہا ہے۔ یوں تو انسان اس دنیا میں بہت محنت اور کوشش کرتا ہے لیکن جو اسے وہی ملتا ہے جو اس کے نصیب میں ہوتا ہے۔ نصیب لکھا ہوا وہ رزق ہے جو انسان کو لازماً مل کے رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کا لکھا ہوا نصیب اسے تلاش کرتا ہے۔ لیکن دنیا میں عموماً انسان جو حاصل کرتا ہے، اس سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ جو ملتا ہے، اس پر گلہ شکوہ کرتا ہوا نظر آتا ہے اور مزید کی طلب رکھتا ہے۔ لیکن شاعر اس کے برعکس قناعت کا درس دے رہا ہے۔ وہ صبر اور شکر کا رویہ اختیار کر رہا ہے۔ اسے اپنی قسمت سے کسی قسم کا کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ وہ اپنے نصیب سے راضی بہ رضا ہے۔

پہلے مصرع میں قناعت اور شکر دونوں پہلو موجود ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسے جو ملا، وہی زیادہ تھا۔ اس بیان میں قناعت یعنی مطمئن رہنا اور جو مل گیا ہے، اس پر شکر کرنے کا رویہ موجود ہے۔ جب کہ دوسرے مصرع میں وہ کہتا ہے کہ اسے جو ملا نہیں، اس نے کبھی اس کی تمنا ہی نہیں کی تھی۔ اس نے کبھی ان چیزوں کی خواہش اپنے دل میں پالی ہی نہیں تھی۔ گویا اس میں قناعت کے ساتھ صبر کا پہلو موجود ہے کہ وہ جو مل گیا ہے، اسی پر قانع ہونے کے ساتھ ساتھ صابر بھی ہے۔ الغرض شاعر اپنی زندگی سے مطمئن ہے اور کسی قسم کا کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے۔ امجد اسلام امجد نے بھی اسی صبر و شکر کی تلقین کرتے ہوئے کہا تھا:

کہاں آ کے رکنے تھے راستے، کہاں موڑ تھا اسے بھول جا وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اسے بھول جا

Geniusnesthub.com

مشق

ا۔ اس غزل کے مطلع اور مقطع کی تشریح کریں۔

جواب: دیکھیے تشریحات

۲۔ اس غزل کے کس شعر میں صنعتِ مراعاۃ النظیر کا استعمال کیا گیا ہے؟

جواب: یہیں پھرتے ہیں شریف آدمیوں کی صورت دشت میں خاک اُڑائی نہیں، وحشت نہیں کی

اس شعر میں شریف کی مناسبت سے خاک نہ اُڑانا اور وحشت نہ کرنا کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

۳۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں۔

جواب: شِرَاکَت، دَشْت، سُلُوک، مُیَسَّر

۴۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کریں۔

ظرف اتنا بھی کشادہ نہیں اپنا، لیکن ہم نے پیدا بھی ہوئی ہے تو شکایت نہیں کی

ہو رہا ہے جو، اسی طرح سے ہونا تھا یہاں اس لیے ہم نے کسی بات پہ حیرت نہیں کی

جواب: دیکھیے تشریحات

۵۔ دی گئی غزل کے مطابق درست جملے کے سامنے (✓) کا نشان اور غلط کے سامنے (✗) کا نشان لگائیں۔

ا۔ شاعر محبوب کے خوابوں میں حصے دار نہیں ہوتا۔ ✓

ب۔ محبوب کی جفاؤں سے شاعر وحشت زدہ ہو گیا۔ ✗

ج۔ شاعر نے بے وفائی کا بدلہ لیا۔ ✓

د۔ شاعر نے جان بوجھ کر محبوب کا ساتھ نہیں دیا۔ ✓

ہ۔ سوال کرنا شاعر کو اچھا نہیں لگتا۔ ✓

و۔ شاعر کو محبوب کے رویے پر بے حد حیرت ہے۔ ✗

ز۔ شاعر کا ظرف بے پناہ وسیع ہے۔ ✗

ح۔ شاعر اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے سوال نہیں کرتا۔ ✓

ط۔ ''وصالِ یار'' شاعر کی حسرت ہے۔ ✗

ی۔ چاہت کے باوجود شاعر ہمت نہ کر سکا۔ ✓

Geniusnesthub.com
CamScanner

اضافی مختصر سوال جواب

سوال ۱: شاعر کو محبوب سے محبت کیوں نہیں ہے؟

جواب: شاعر کے نزدیک محبوب کبھی اس سے مل بیٹھا ہی نہیں اور نہ ہی اس نے کبھی شاعر کو اپنے خوابوں میں شریک کیا ہے اس لیے وہ سمجھتا ہے کہ اس سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔

سوال ۲: شاعر نے اپنے پھرنے کو شریف آدمیوں کی صورت کیوں کہا ہے؟

جواب: شاعر کے خیال میں اس نے کبھی عاشقوں کی طرح صحرا میں خاک نہیں چھانی اور نہ ہی کبھی دیوانوں کی طرح دیوانگی کی اظہار کیا ہے۔ اس لیے وہ سمجھتا ہے کہ اس کا پھرنا شریف آدمیوں کی صورت ہے۔

سوال ۳: شاعر کو جو ہو رہا ہے اُس پر حیرت کیوں نہیں ہے؟

جواب: شاعر کے خیال میں جو ہو رہا ہے اُسے اسی طرح ہونا تھا یعنی اس کا یقین ہے کہ جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے وہی ہوتا ہے، اس لیے اسے کسی بھی بات پر حیرت نہیں ہوتی۔

اضافی کثیر الانتخابی سوالات

☆ ہر سوال کے چار ممکنہ جوابات (ا، ب، ج، د) دیئے گئے ہیں، درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

1- ظفر اقبال کا سنِ پیدائش ہے:

ا۔ ۱۹۲۳ء ب۔ ۱۹۲۴ء ج۔ ۱۹۲۵ء د۔ ۱۹۲۶ء

2- ظفر اقبال کہاں پیدا ہوئے؟

ا۔ لاہور ب۔ ساہیوال ج۔ اوکاڑہ د۔ ملتان

3- کس نے انھیں بیسویں صدی ادبی مرتد قرار دیا ہے؟

ا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ب۔ ڈاکٹر انور سدید ج۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری د۔ ڈاکٹر شہاب الدین

4- شاعر یہی کس کی صورت پھرتا ہے؟

ا۔ عاشق ب۔ دیوانہ ج۔ بدمعاش د۔ شریف آدمی

5- یہاں جو ہو رہا ہے اس پر شاعر نے کس چیز کا اظہار نہیں کیا؟

ا۔ حیرت ب۔ خوشی ج۔ حیرانی د۔ خوف

6- شاعر کو جو چیز نہیں ملی اس نے کبھی اس کی _____ نہیں کی:

ا۔ دعا ب۔ حسرت ج۔ چاہت د۔ التجا

جوابات

1-	ا	2-	ج	3-	ج	4-	د	5-	ا
6-	ب								

Geniusnesthub.com
CamScanner

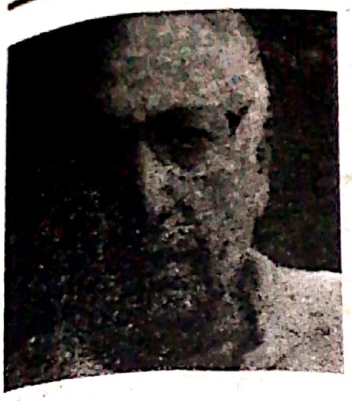

شہزاد احمد

(1932ء - 2012ء)

تعارف:

زندگی کے حالات: شہزاد احمد امرتسر میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ محمد بشیر تھا جنھوں نے طب کے موضوع پر اُردو میں کئی کتابیں تحریر کیں۔ شہزاد احمد نے میٹرک کا امتحان امرتسر سے پاس کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُن کا خاندان لاہور منتقل ہوا۔ انھوں نے ایم۔اے۔او کالج لاہور سے بی۔اے کیا اور اس کے بعد فلسفہ اور نفسیات میں ایم۔اے کیا۔ حصولِ رزق کے لیے اُنھوں نے مختلف ملازمتیں کیں۔ وہ مختلف رسائل میں لکھتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ محمود شام کے ساتھ مل کر ایک رسالے ''معیار'' کا بھی اجرا کیا۔ اُنھیں ۱۹۹۷ء میں صدارتی ایوارڈ برائے حسنِ کارکردگی عطا کیا گیا۔

ادبی خدمات: اردو کے جدید شعرا میں ایک اہم نام شہزاد احمد ہے جنھوں نے زندگی کے بدلتے ہوئے حالات اور جدید تقاضوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ وہ جذباتی سطح پر متوازن، فکری سطح پر متحرک اور تحقیقی سطح پر فعال ہیں۔ اسلوب کی تازہ کاری سے اُنھوں نے غزل کو نئی جہت سے آشنا کیا۔

اُن کا تخلیقی عمل صرف اپنی ذات کے گرد نہیں گھومتا، بلکہ اُنھوں نے انسانی مسائل اور عالمگیر حقائق کی روشنی میں اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے ہاں انسانی فطرت کی پیچیدگیوں کے ساتھ حالات و واقعات کا خارجی و داخلی آہنگ ہے۔ اُنھوں نے علم، مطالعہ اور احساس و تخیل سے انسانی فطرت کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی غزل اُن کے ہاں لوگوں کا نوحہ ہے، جن میں منافقت رچی بسی ہے اور احساسِ زیاں سے عاری ہیں۔ کبھی کبھی سائنسی، نفسیاتی اور فلسفیانہ افکار کی کثرت سے غزل کی روایات مجروح ہوتی نظر آتی ہیں، لیکن بحیثیتِ مجموعی انھوں نے غزل کی روایات کی پاسداری کی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اُنھیں نئی غزل کا مزاج دان کہا ہے۔

تصانیف/مجموعہ ہائے کلام: صدف، جلتی بجھتی آنکھیں، ادھ کھلا دریچہ، خالی آسمان، بچھڑ جانے کی رُت، دیوار پہ دستک، ٹوٹا ہوا پُل، کون اُسے جاتا دیکھے، پیشانی میں سورج، اُترے میری خاک پہ ستارہ۔ اسلامی فکر کی نئی تشکیل۔

لغت و توضیحات

تعارف (صفحہ نمبر 242)

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
اسلوب	انداز	خارجی و داخلی آہنگ	باہر اور اندر کی دنیا کے درمیان ربط ہونا
فعال	چست، عمل کرنے والا	عالمگیر حقائق	ساری دنیا کی حقیقتیں
جہت	سمت، پہلو	نوحہ	غم بیان کرنا
پیچیدگیوں	مشکل اور الجھی ہوئی چیزیں	احساسِ زیاں	کسی چیز کے کھو جانے کا احساس
تخیل	سوچ، خیال	مزاج دان	مزاج جاننے والا
منافقت	دوہرا معیار، ظاہر اور باطن میں فرق	پاسداری	کسی چیز پر عمل کرنا، اس کا پاس رکھنا

Geniusnesthub.com
CamScanner

اشعار کی تشریح

(۱)

نہ سہی کچھ مگر اتنا تو کیا کرتے تھے　　وہ مجھے دیکھ کے پہچان لیا کرتے تھے

مفہوم: مجھے محبوب سے کچھ زیادہ توقع نہیں ہے، بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ مجھے دیکھ کر پہچان لیتا ہے۔

تشریح

اس شعر میں شاعر روایتی انداز میں محبوب کی بے رخی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پہلے زیادہ تو نہیں لیکن اتنا ضرور ہوتا تھا کہ اس کا محبوب اسے دیکھ کر پہچان لیا کرتا تھا لیکن اب اس کی بے رخی کا یہ عالم ہے کہ وہ اسے پہچانتا بھی نہیں ہے۔ محبوب کی عادت تو بے رخی ہی ہے۔ وہ کبھی عاشق کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ اس سے نظر انداز ہی کرتا ہے۔ شاعر بھی اپنے محبوب کے بارے میں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کا مزاج بھی ایسا ہی ہے۔ وہ کبھی بھی عاشق پر زیادہ مہربان نہیں ہوتا اور وہ ہمیشہ اس سے بے رخی کا انداز اختیار کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ لیکن مجھے اس بات کی خوشی رہتی تھی کہ سب باتوں کے باوجود، محبوب جب بھی اسے دیکھتا تھا، اسے پہچان لیتا تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ اس کے لیے یہی اعزاز ہی کافی تھا۔ مگر اب تو اس سے یہ خوشی بھی چھین لی گئی ہے۔ محبوب جب اسے دیکھتا ہے تو اسے پہچاننے ہی سے انکار کر دیتا ہے۔ گویا وہ ذرا سی خوشی بھی زندگی سے رخصت ہو چکی ہے۔

غم ہے نہ اب خوشی ہے، نہ امید ہے نہ یاس　　سب سے نجات پائے زمانے گزر گئے

(۲)

آخر کار ہوئے تیری رضا کے پابند　　ہم کہ ہر بات پہ اصرار کیا کرتے تھے

لغت: رضا: چاہت، پسند۔ پابند: محدود ہو جانا۔

مفہوم: آخرِ کار میں محبوب کی رضا کا پابند ہو گیا ورنہ میں تو ہر بات پر ضد کیا کرتا تھا۔

تشریح

اس شعر میں شاعر محبت کا فلسفہ بیان کر رہا ہے کہ انسان جب محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ اپنے محبوب کی رضا کا پابند ہو جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبت سے پہلے تو اس کا مزاج ایسا تھا کہ وہ ہر بات پر ضد کیا کرتا تھا۔ چاند ستاروں کی خواہش کرتا تھا اور انھیں پانے کے لیے اصرار کرتا تھا۔ لیکن اس کے مزاج میں یہ ضد اور انا صرف اس وقت تھی جب تک وہ محبت کے جال میں قید نہیں ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ محبت کا اسیر ہوا، آہستہ آہستہ اس کا مزاج ہی بدل گیا۔ کہاں وہ پہلے ہر بات پر اڑنے والا تھا لیکن اب یہ عالم ہے کہ وہ اپنے محبوب کی رضا ہی میں راضی رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ وہ وہی کرے جو اس کے محبوب کو پسند ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے کہ جس میں انسان کسی کے رنگ میں رنگتا چلا جاتا ہے۔ اسی لیے تو اللہ قرآن میں مومنین سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے رنگ میں رنگ جائیں۔ انسان جب محبت کے حقیقی جذبے سے آشنا ہوتا ہے تو پھر اس کے اندر انا پسندی اور غرور جیسے جذبات خارج ہوتے جاتے ہیں۔ وہ تسلیم و رضا کا پیکر بنتا چلا جاتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد ہی محبوب کی رضا میں راضی رہنا ہوتا ہے۔ شاعر بھی اسی بات کا اظہار کر رہا ہے کہ اب وہ محبت کے اس مقام پر ہے جہاں وہ اپنے

Geniusnesthub.com

CamScanner

محبوب کی رضا کا پابند ہے۔ محبت کے اس مقام کا ذکر کرتے ہوئے نواب علی اصغر نے کہا تھا:

اگر بخشے زہے قسمت، نہ بخشے تو شکایت کیا　　سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

(۳)

خاک ہیں اب تری گلیوں کی وہ عزت والے　　جو ترے شہر کا پانی نہ پیا کرتے تھے

لغت: خاک ہیں: بے عزت ہیں۔

مفہوم: وہ لوگ جو بڑی شان اور مرتبے والے تھے اور تیرے شہر کا پانی بھی پیا نہیں کرتے تھے، اب رسوا ہو چکے ہیں۔

تشریح

اس شعر میں شاعر نے عشق میں خاک ہو جانے کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لوگ کبھی خود کو بہت عزت دار سمجھتے تھے۔ وہ انا اور خودداری کا بھرم قائم رکھتے تھے۔ جب بھی کبھی ان کے سامنے محبوب کا ذکر آتا تھا، تو وہ منہ پھیر لیا کرتے تھے۔ وہ خود کو اتنا معزز اور انا پسند سمجھتے تھے کہ کبھی محبوب کے کوچے کا پانی تک پینا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب انھی لوگوں نے محبوب کو دیکھ لیا تو وہ اس کے عشق میں ایسے گرفتار ہوئے کہ پھر اسی کے ہو کر رہ گئے۔ وہ بار بار کوچہ محبوب کی طرف جانے لگے۔ ان کا زیادہ تر وقت محبوب کے کوچے ہی میں بسر ہونے لگا۔ مصحفی نے اس کیفیت کو کچھ یوں بیان کیا تھا:

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا　　کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا

شاعر کہتا ہے کہ کچھ یہی حال ان لوگوں کو ہوا۔ جو کبھی بڑے خوددار اور انا پسند تھے۔ لیکن عشق اور محبت نے انھیں ایسا نکما کر دیا کہ وہ کسی کام کے نہ رہے۔ دراصل شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ انسان کی انا اور خودداری صرف اس وقت تک ہے، جب تک وہ عشق و محبت کی راہ کا مسافر نہیں بن جاتا۔ جب وہ اس راہ پر چل پڑتا ہے تو پھر وہ خاک ہو جاتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ کبھی وہ عزت والا تھا، مقام والا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مٹی کے ساتھ مٹی کر لیتا ہے اور میر تقی میر کی طرح خوار پھرتا رہتا ہے۔ بقول میر:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں　　اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

(۴)

اب تو انسان کی عظمت بھی کوئی چیز نہیں　　لوگ پتھر کو خدا مان لیا کرتے تھے

مفہوم: آج کل تو انسان کی عظمت کا تصور بھی ختم ہو چکا ہے ورنہ تو کسی زمانے میں لوگ پتھر کو بھی خدا مان لیتے تھے۔

تشریح

اس شعر میں شاعر موجودہ زمانے میں ہونے والے انسان کے زوال کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے ہاتھوں سے خلق کیا۔ اسے عزت دی اور مکرم کیا۔ اسے بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔ اسے فرشتوں سے سجدہ کروایا۔ پھر اسے زمین پر اپنا نائب بنا کر اُتارا تا کہ وہ زمین پر اللہ کی بادشاہت قائم کرے۔ اس سارے معاملے میں بنیادی نکتہ یہی تھا کہ انسان چوں کہ اشرف المخلوقات ہے، اس لیے یہ بھاری ذمہ داری اس کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے۔

Geniusnesthub.com
CamScanner

لیکن آج جدید دور میں انسان اپنا مقام اور کردار بھول گیا۔ وہ بھول گیا کہ وہ کتنا عظیم ہے اور اسے کس مقصد کے لیے زمین پر اتارا گیا ہے۔ آج کے دور میں انسان اپنی نفسانی خواہشات کا غلام بن بیٹھا۔ وہ ان کے پیچھے چلتے چلتے اس قدر دور نکل گیا ہے کہ اس کے لیے انسانیت اور حیوانیت میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ وہ گرتے گرتے حیوانیت کی سطح تک پہنچ چکا ہے۔ وہ بھول گیا ہے کہ اس کے اور حیوانوں کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے کہ وہ صرف نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے نہیں بھیجا گیا بلکہ وہ ایک خاص مقصد کے ساتھ اس زمین پر اُتارا گیا ہے۔

شاعر اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج کا انسان انسانی عظمت کے تصور سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ ورنہ یہی انسان تھا کہ اپنے دورِ جہالت میں یہ پتھروں کو خدا بنا لیا کرتا تھا۔ پھر اللہ نے انسان کو اس کی حقیقت سے آشنا کیا اور اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے اسے بتایا کہ وہ کس قدر عظیم ہے اور زمین پر خدا کا نائب ہے۔ لیکن آج کا انسان یہ سبق بھی بھول گیا۔ وہ اپنی نفسانی خواہشات کے جال میں اس طرح جکڑا گیا ہے کہ انسان بننا اسے اب مشکل نظر آتا ہے۔ بقول شاعر:

آدمی ظلمتوں میں ڈوب گیا　　چاند تارے رہے تماشائی

(۵)

دوستو! اب مجھے گردن زدنی کہتے ہو　　تم وہی ہو کہ مرے زخم سیا کرتے تھے

لغت: گردن زدنی: جسے قتل کیا جانا ہو۔ زخم سیا: علاج کرنا، چارہ گری کرنا، دوستی نبھانا۔

مفہوم: اے میرے دوستو! تم آج مجھے واجب القتل سمجھتے ہو جب کہ کبھی تم ہی میرا ساتھ دیا کرتے تھے۔

تشریح

اس شعر میں شاعر دوستوں کی بے وفائی اور بے رخی کا گلہ کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے دوست کبھی اس کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ عشق کی راہ میں جب اسے زخم ملتے تھے تو وہ اس کے زخم سیا کرتے تھے۔ اس کے غم میں شریک رہا کرتا تھے۔ شاعر یہی اپنے دوستوں کو یاد دلا رہا ہے کہ کبھی وہ بھی زمانہ تھا جب وہ اس کے چارہ گر ہوا کرتے تھے۔ جب شاعر ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھاتا تھا، وہ اس کے ہم نوا ہوا کرتے تھے لیکن آج یہ ستم ہے کہ وہی لوگ زمانے کے ساتھ مل کر شاعر کو واجب القتل قرار دے رہے ہیں۔ وہ اس کے مرنے کے خواہاں ہیں۔ شاعر دوستوں کی اس بے وفائی سے بہت رنجیدہ ہے۔ حبیب جالب نے اپنے دوستوں کی اسی بے وفائی پر کہا تھا:

دشمنوں نے جو دشمنی کی ہے　　دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

دراصل شاعر اس شعر میں اپنے زمانے کی مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ لکھ رہا ہے۔ یہ دراصل دوستوں کے پردے میں دو زمانوں کا موازنہ بھی ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ حق کا ساتھ دیا کرتے تھے اور تکلیف میں مبتلا لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھا کرتے تھے۔ لیکن آج زمانے کی گردش نے انھیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ دوست بھی دشمنی پر آمادہ ہیں۔ کوئی بھی حق کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ نہیں۔ دنیا کی محبت اور موت کے خوف سے سبھی چپ ہیں۔ کوئی بھی چارہ گری کے لیے تیار نہیں۔ یہی دکھ ہے جو شاعر کے اس شعر میں نظر آتا ہے۔ بقول ناصر کاظمی:

یہ کون لوگ ہیں میرے ادھر ادھر　　وہ دوستی نبھانے والے کیا ہوئے

Geniusnesthub.com

CamScanner

(۶)

اب تو شہزاد ستاروں پہ لگی ہیں نظریں　　کبھی ہم لوگ بھی مٹی میں جیا کرتے تھے

مفہوم: اب تو ہر کوئی ستاروں پر نظریں جمائے بیٹھا ہے، ورنہ کبھی ہم لوگ تو اپنی مٹی ہی میں جیا کرتے تھے۔

تشریح

غزل کے مقطع میں شاعر ترقی کے نام پر مٹنے والی اقدار کا نوحہ لکھ رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک انسان نے بہت زیادہ ترقی نہیں کی تھی، وہ سادہ مٹی کے گھروں میں رہا کرتا تھا۔ اس کے اندر انسانیت اور محبت کا رشتہ زندہ تھا۔ لوگ مٹی میں رہتے تھے اور اسی میں جیا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے دکھ سکھ اور محبت کے رشتوں میں جڑے رہتے تھے۔ ایک دوسرے سے پیار کا تعلق قائم رہتا تھا۔ زندگی محبت اور رشتوں کا نام تھی لیکن پھر یہ ہوا کہ انسان نے بے پناہ ترقی کا سفر طے کر لیا۔ وہ ستاروں پر کمندیں ڈالنے لگا اور خلاؤں کو تسخیر کرنے لگے۔ اس کی نظر ستاروں سے بھی آگے جہاں کھوجنے لگی۔ اس نے بہترین ایجادات سے زندگی کے معیار کو بلند کر لیا۔ لیکن اس کی زندگی مٹی سے بلند ہوئی اور فلک بوس عمارتوں میں مقید ہو گئی۔ اس نے پتھر، اینٹ اور لوہے سے بڑے بڑے تو شہر تعمیر کر لیے لیکن ترقی کے اس عمودی سفر میں وہ اپنی اعلیٰ روایات اور اقدار سے محروم ہو گیا۔ بقول سید ضمیر جعفری:

زندگی نیچے کہیں منہ دیکھتی ہی رہ گئی　　کتنا اونچا لے گیا جینے کا معیار آدمی

اس سفر میں ایک دوسرے سے ہاتھ چھوٹ گئے اور انسان، انسان سے دور ہوتا چلا گیا۔ آج کے جدید زمانے میں انسان سائنسی طور پر تو بہت ترقی یافتہ ہو گیا ہے لیکن تنہا ہو گیا ہے۔ وہ اپنی ہی ترقی کے قید خانے میں قیدِ تنہائی کی زندگی گزار رہا ہے۔ آج کا انسان تہذیب، روایات اور اعلیٰ اقدار سے اس طرح محروم ہو چکا ہے، گویا وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ اسی لیے شاعر ترقی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگرچہ آج نظریں ستاروں پر جمی ہیں لیکن انسان کا انسان سے تعلق کمزور پڑ چکا ہے۔ آسمانوں پر کمندیں ڈالتے ڈالتے ہم بھول بیٹھے ہیں کہ کرہ ارض پر انسانیت کے چراغ بجھتے چلے جا رہے ہیں۔ بقول احمد فراز:

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو　　کرہ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

مشق

ا۔ غزل کے مطابق درج ذیل سوالوں کے جواب لکھیں۔

ا۔ شاعر نے اصرار کرنا کیوں چھوڑ دیا؟

جواب: جب سے شاعر اپنے محبوب کی مرضی کا پابند ہو گیا ہے اور اس نے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر لیا ہے، اس نے اصرار کرنا چھوڑ دیا ہے۔

Geniusnesthub.com
CamScanner

ب۔ گلیوں کی خاک ہونے سے کیا مراد ہے؟

جواب: محبت سے پہلے یا آغاز میں انسان اپنی انا میں ہوتا ہے لیکن جب وہ راہِ محبت کا مسافر بن جاتا ہے تو اس کی انا اور غرور ختم ہو جاتا ہے، پھر وہ محبت کی گلیوں میں خاک ہو جاتا ہے یعنی اس کے اندر عجز اور خاکساری پیدا ہو جاتی ہے۔

ج۔ زخم سینے سے کیا مراد لی گئی ہے؟

جواب: زخم سینے سے مراد ہے کہ مصیبت کے وقت میں کسی کے کام آنا۔ اس کے دکھ سکھ میں شریک ہونا اور اس کا حوصلہ بڑھانا ہے۔

د۔ کسی کے شہر کا پانی تک نہ پینا، کس بات کی غمازی کرتا ہے؟

جواب: کسی کے شہر کا پانی تک نہ پینے سے مراد ہے خودداری اور انا کا مظاہرہ کرنا ہے۔ یعنی کسی کے آگے اپنی انا اور غرور کو جھکنے نہ دینا۔ اس میں کسی قدر دوسرے کے لیے تحقیر کا پہلو بھی شامل ہے۔

ہ۔ شاعر نے ستاروں پر نظریں کیوں لگائی ہیں؟

جواب: شاعر نے بلندی پر نظریں اس لیے لگائی ہیں کیوں کہ وہ ترقی کا خواہاں ہے۔ وہ چاند ستاروں کو تسخیر کرنا اور ان پر دسترس حاصل کرنا چاہتا ہے۔

۲۔ اس غزل کی ردیف لکھیں۔

جواب: اس غزل کی ردیف ہے: ''کرتے تھے''

۳۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں۔

جواب: گَرْدَنْ زَدْنِی، رَضَا، اِصْرَار، شَہر، عَظَمَت

۴۔ درج ذیل شعر کی تشریح کریں۔

آخر کار ہوئے تیری رضا کے پابند ہم کہ ہر بات پہ اصرار کیا کرتے تھے

جواب: دیکھیے تشریحات

اضافی مختصر سوال جواب

سوال ۱: شاعر کے نزدیک عزت والے کس مقام تک جا پہنچے ہیں؟

جواب: شاعر کے خیال میں جو عزت والے تھے وہ محبوب کی گلیوں میں خاک ہو چکے ہیں۔

سوال ۲: شاعر کے خیال میں انسان کی عظمت میں کیا فرق آیا ہے؟

جواب: شاعر کے خیال میں انسان کی عظمت اب بالکل ختم ہو چکی ہے۔

Geniusesthub.com

CamScanner

اضافی کثیر الانتخابی سوالات

☆ ہر سوال کے چار ممکنہ جوابات (ا، ب، ج، د) دیئے گئے ہیں، درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

-1 شہزاد احمد کا سنِ پیدائش ہے:

ا۔ ۱۹۳۲ء ب۔ ۱۹۳۳ء ج۔ ۱۹۳۴ء د۔ ۱۹۳۵ء

-2 شہزاد احمد کا سنِ وفات ہے:

ا۔ ۲۰۱۰ء ب۔ ۲۰۱۱ء ج۔ ۲۰۱۲ء د۔ ۲۰۱۳

-3 شہزاد احمد کہاں پیدا ہوئے؟

ا۔ لاہور ب۔ دہلی ج۔ لکھنؤ د۔ امرتسر

-4 شاعر پہلے ہر بات پر کیا کرتا تھا؟

ا۔ اقرار ب۔ اصرار ج۔ انکار د۔ تکرار

-5 شاعر کے نزدیک عزت والے محبوب کی گلیوں میں کیا ہو چکے ہیں؟

ا۔ پسندیدہ ب۔ ناپسندیدہ ج۔ خاک د۔ دیوانے

-6 کون شاعر کو اب گردن زدنی قرار دیتا ہے؟

ا۔ لوگ ب۔ دوست ج۔ دشمن د۔ زمانہ

-7 شاعر کے خیال میں اب نظریں کہاں لگی ہیں؟

ا۔ شہرت پر ب۔ دولت پر ج۔ حکومت پر د۔ ستاروں پر

جوابات

-1	ا	-2	ج	-3		د	-4	ب	-5	ج
-6	ب	-7	د							

Geniusnesthub.com